عمران ازفر
لیکچرر، شعبہ اُردو، اسلام آباد ماڈل کالج
فار بوائز I-8/3، اسلام آباد

مغربی پنجاب پر مسلم اور انگریز معاشرت کے اثرات

Imran Azfar
Lecture, Department of Urdu,
Islamabad Model College, For Boys I-8/3, Islamabad.

Social effects of the Muslims and British on West Punjab

Punjab is a fertile land of vast lush green plains and ancient cultures. Many invaders in history came to occupy it to exploit its fertility. This occupation left profound social and political impact upon this region. This study deals with the influences of two major occupants, the Muslims and the British, on this region expanding from the period of Muhammad Bin Qasim to the epoch of East India Company. This study discusses the linguistic, cultural and political influences of these two nations on this land.

اسطورہ، روایت اور تمدن وتہذیب کا اقوامِ عالم کی زندگی میں اُسی طرز کا درجہ ہے جو کسی بھی عام یا خاص فرد کی زندگی میں حافظے کا ہوتا ہے، حافظہ اگر ناکارہ ہو تو انسان کی حیثیت ایک چوپائے کی سی رہ جاتی ہے، موجودہ مادی اور سائنسی بنیادوں پر پرورش پاتے معاشرے میں، ظاہری حالت میں یادوں کا عمل بے معنی اور بے سُود دکھائی دیتا ہے، حتیٰ کہ بعض اصحاب تو اس کو مریضانہ اندازِ فکر سے تعبیر کرتے ہیں اور کارِ لاحاصل گردانتے ہیں کہ اس سارے عمل سے کوئی مادی (Materialistic) منفعت حاصل نہیں کی جا سکتی، مگر اس بھید کی معنویت صرف اُس پر آشکار ہوتی ہے جو اس بات کی اہمیت سے واقف ہو کہ ماضی اور اُس کی یادداشت ہماری شخصی اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہیں۔ اگر یہ سرمایہ نہ ہو تو فرد اور معاشرہ اپنی بنیاد سے نا آشنا رہ جاتے ہیں۔ کسی معاشرے، ملک یا سلطنت کے علمی، معاشرتی، سماجی ورثے کو ایک خاص تنظیم کے ساتھ کئی طریقوں سے مرتب کیا جا سکتا ہے جس کی ایک صورت تاریخ نویسی ہو سکتی ہے۔ مورخ اپنے عہد اور اُس سے منسلک زمانوں کا احوال قلم بند کر کے اُسے اقوام اور نسلوں کے حافظے کا حصہ بنا سکتا ہے۔ ایک اور صورت سماجی تاریخ نویسی کی یہ ہے کہ ادبی منظر نامے سے معاشرے کے احوال، اقدار، سماجی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی غرض ہر قسم کی صورتِ حال کو اُن کی زندہ اساطیری، روائیتی یا تمدنی وتہذیبی چاشنی کے ساتھ قلم بند کیا جائے تا کہ یہ لوازماتِ

حیات اقوام کی مجموعی کردار سازی اور تعمیر وترقی میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ ہمارے ہاں سماجی تاریخ کا کام بہت کم مقدار میں ہوا ہے، ہماری تاریخیں بالعموم بادشاہوں کی فتح وشکست کے کارناموں سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں واقعیت، حکیمانہ معروضیت اور سماجی طرزِ زندگی کا اثر بہت کم ہے۔ اگر قدیم ہندوستان کی تہذیبی وتمدنی زندگی کی از سرِ نو تعمیر وتشکیل کی ضرورت آن پڑے تو یہ تواریخ، اس عمل کی بہ خوبی تکمیل کیلئے ناکافی ہوں گی اور اگر اس نوع کی ضرورت ادبی تاریخ نویسی یا سماجی تاریخ نویسی کی ذیل میں در آئے تو ایک بہت بڑی دشواری حامل مفروضہ کو درپیش ہوگی۔ جو کہ معروضی تجزیے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ آج یہ معلوم کرنا از حد مشکل ہے کہ عہد قدیم میں شعرا، نثر نگار، تاجر، دکاندار، طباخ نانبائی غرض ہر طبقہ فکر کے لوگ کس ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے، ان کے گھر، ماحول اور سماج کی عمومی اور خصوصی فضا کیا تھی اور ان دو حالتوں میں بنیادی اختلاف کیا تھا۔ معروفیات، تفریحات، نصاب، مذہبی وملی عقائد، دوست اور ہم خیال، معاشقے، تصورات، اخلاق اور معاشرتی آداب کس کس نوعیت اور کس کس رنگ کے تھے اور اس ساری کردار اور فکر سازی میں کون سے عوامل کارفرما تھے۔ ان کا ذخیرہ رسم وعقائد اور تہذیب وتمدن کس نوعیت کا تھا اور ان کے بنیادی وثانوی ماخذات کیا تھے۔

ہندوستانی اور ترک ایرانی تہذیبیں آج کئی اُتار چڑھاؤ دیکھ کر ایک نئے مرکز پر آئی کھڑی ہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ بامعنی ہوگا کہ ان دو تہذیبوں کے ملاپ باہمی سے جو خمیر تیار ہو کر برصغیر کے طول وعرض میں پھیلا تھا، آج اُس نئی تہذیب کو ایک اور تہذیبی مدافعت کا سامنا ہے جو اس شیرازے میں مدغم ہوتی جا رہی ہے۔ اس نئی تہذیب نے اُنیسویں صدی کے انجام کے عشروں میں، اس ہند ایرانی تہذیبی عنصر کو متاثر کرنا شروع کیا اور تاج برطانیہ کی طویل مداخلت کے بعد آج یورپی امریکی تمدن اس کو متاثر کر رہا ہے۔ ہند ایرانی تہذیب نے اس خطے کو آزادیٔ فکر، رندی وقلندری، رواداری، مساوات، صبر ورضا، وفا پیشگی، وحدت الوجود اور انسان دوستی جیسی عظیم روایات سے بہرہ مند کیا اور یہ رنگ وآہنگ ہند آریائی اور ہندو دراوڑی ملاپ سے تعمیر شدہ ہندوی تہذیب میں اس انداز سے رچا بسا اور مقبول ہوا کہ اس کی گونج دور دور تک سنائی دی اور اس کی رنگ آمیزی سے دہلی سے لاہور تک ہر کوچہ، ہر دروازہ، ہر ملک اور ہر شخص ایک نیا غازہ اپنے فکر وجدان پر لے کر نکلا کہ ہر آئینہ اس تہذیبی وفکری امتزاج کا مکمل عکس ہوا۔

ہمارے اس مقالے کا اصل منتہا ومقصود مغربی پنجاب میں تاریخ کے دو بڑے ادوار میں وارد ہونے والی اقوام مسلمان اور انگریز کے اس خطے پر مرتب ہونے والے فکری، سماجی اور تہذیبی اثرات کا جائزہ لینا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے متحدہ ہندوستان پر اولاً نو وارد مسلمانوں کی آمد کے اثرات کا مختصر جائزہ لیا جائے گا کیونکہ ان کی عسکری اور تعلیمی برتری نے اس خطے کو بہت حد تک متاثر کیا۔ اس کے بعد پنجاب کے جغرافیائی، سماجی، معاشرتی منظر نامے پر بحث ہے اور ان تمام بیرونی اثرات سے نو تعمیر شدہ معاشرے کا احوال بیان کی جائے گا۔ یوں پھر دریافت شدہ معلومات کی روشنی میں مغربی پنجاب میں لکھی جانے والی نظم کا جائزہ لیا جائے گا، جس سے اُن حالات اور واقعات کی نشاندہی ہو سکے جو اس نئی تربیت کا حاصل ہیں۔ نظم پر اطلاق تنقید حصہ دوم میں ہوگی، حصہ اول تاریخی اور سماجی شواہد کی روشنی میں مغربی پنجاب میں عہد بہ عہد تبدیلی کا جائزہ ہے۔ سید ضمیر حسین دہلوی، البیرونی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

''البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستان کے شہروں کی ایک کمزوری کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ راجپوتوں کے

زمانے میں شہری زندگی کی تنظیم میں ذات پات کے تصورات کو بڑا دخل تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں کے سوا کسی کو شہر کی چار دیواری کے اندر رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ نچلے طبقے کے لوگ سب شہر سے باہر رہتے تھے۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد شہروں کا نقشہ ایک دم بدلنے لگا۔ شہر کے دروازے سب پر کھول دیئے گئے اور اب اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طبقے کے مکانات پہلو بہ پہلو دکھائی دینے لگے۔ پروفیسر مجیب نے اس تبدیلی کو شہری انقلاب سے تعبیر کیا ہے۔ اسی زمانے میں ہندو اور مسلمانوں دو مختلف قوموں کے درمیان تہذیبی مصالحت کا کام شروع ہوا۔ اس میں شعوری اور لاشعوری دونوں قوتوں کو دخل تھا۔ لباس، زبان اور رسم ورواج غرض کہ زندگی کے کسی شعبے کی مثال سامنے رکھئے۔ ایک تبدیلی اس دور میں جنم لیتی نظر آتی ہے۔ دِلوں کی کشادگی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ تنگ نظری یہاں تک دور ہو گئی تھی کہ لوگوں نے ایک دوسرے کی زبان کھانوں اور لباس وغیرہ کو بے دریغ اپنانا شروع کر دیا تھا۔ بعض اوقات ہندو اور مسلمان میں تمیز کرنا مشکل ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوانی پگڑی کو اپنے لئے پسند کر لیا تھا اور ہندوؤں نے مسلمانی پوشاک کو یہاں تک اپنا لیا تھا کہ کنور محمد اشرف کے بیان کے مطابق اگر ہندو خاص نشان مثلاً کانوں کی مُرکیاں یا تلک وغیرہ ہٹا دیتے تھے تو انہیں پہچاننا ممکن نہ تھا۔ زبان کی اجنبیت اس لئے دور ہو گئی کہ مقامی زبان پر غیر مقامی زبانوں کے اثرات سے ایک نئی زبان وجود میں آ رہی تھی۔ کٹر مسلمان معمولی سوتی کپڑے استعمال کرتے تھے اور حتی الامکان ریشمی کپڑوں سے گریز کرتے تھے۔ پگڑی کا رواج عام تھا اور یہ تقریباً سات گز لمبی ہوتی تھی''۔[۱]

یوں جیسا کہ اس تفصیلی اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت کے زیر اثر تشکیل پانے والا ہندی معاشرہ، اُن کے عقائد، رسوم ورواج، میلے ٹھیلے، سماجی، معاشرتی طرزِ حیات غرض فکری وسماجی سطح پر مسلمانوں کے اثرات کی زد میں ہے اور ان اثرات نے سابقہ تہذیب وتمدن کو خاصی گہرائی تک متاثر کیا ہے۔ ہندوستان کی زندگی کے ایک اہم موڑ پر جنم لینے والی اس تبدیلی نے ایک تہذیبی انقلاب کی صورت اپنی نمو پذیری اور شگفتگی کے بہت سے مراحل طے کئے۔ چنانچہ اس تہذیبی اشتراک و ہم آہنگی نے ایک بڑے رجحان کی صورت فروغ پایا اور ہندوستان کی تمدنی تاریخ کے باب میں خاطر خواہ اضافے کئے ہیں۔

''ایک ہی شہر میں ہندو مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی وجہ سے عوام میں ایک دوسرے کے رسم ورواج میں نمایاں اشتراک پیدا ہو گیا تھا، دہلی میں بہ لحاظ تعداد ہندو مسلمانوں سے کبھی غیر مساوی نہیں رہے۔ ہندوؤں کا اگر خاص طور پر تجارت میں نمایاں حصہ تھا تو مسلمان زیادہ تر نظم ونسق سے متعلق تھے۔ پرانی دلی وشاہ جہاں آباد کے مابین کسی اور چیز کے بجائے اس خصوصی دوستانہ تعلق کی مجھے یقینی اور تصدیقی شہادتیں ملی ہیں''۔[۲]

سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی مندرجہ ذیل رائے بھی صائب ہے لیکن اس سارے منظرنامے کو پروفیسر نثار احمد فاروقی کی اس رائے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''اس زمانے کا رہن سہن اور معاشرت ہند ایرانی یا آریائی اور مغل تہذیب کا امتزاج تھی۔ اس تہذیب میں معیاری نمونہ طبقۂ اشراف اور قلعے کے سلاطین تھے۔ ان کے لباس بھڑکیلے اور کھانے پُر تکلف تھے۔ ظاہری ادب آداب کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ معمولی گفتگو میں بھی کوئی ایسا نقطہ زبان سے نکالنا جس میں بدشگونی یا بداخلاقی کی جھلک ہو

سخت معیوب سمجھا جاتا تھا''۔[۳]

اس ساری بحث کو مزید اُجاگر کرنے سے پہلے مغربی پنجاب کے جغرافیائی، طبعی، عسکری، سماجی، سیاسی، معاشرتی حالات کا جائزہ لینا ازحد ضروری ہے کہ اس کے بِنا بحث اپنے قطعی مدار کے گرد حرکت کرنے سے قاصر رہے گی۔

علمائے تاریخ برصغیر پاک وہند میں ثقافتی اور تمدنی تمیز کے سلسلہ میں دو مختلف آراء کے حامل ہیں، ان میں سے ایک گروہ ہندوستان میں تہذیب وتمدن کے آغاز کو محمد بن قاسم کی آمد سے مشروط کرتا ہے جبکہ دوسرا اس عمل کے تانے بانے دراوڑی عہد سے ملاتا ہے اور ہندوستانی تہذیب کا نکتۂ آغاز محمد بن قاسم کی آمد سے بہت قبل دراوڑ عہد اور اُن کے طرزِ بودوباش تک لے جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ دونوں دعویٰ دار اس سارے سلسلے میں درست ہوں۔ ہمارا مقالہ محمد بن قاسم کی آمد کے بعد برپا ہونے والے نتائج کے اثرات اور پھر اس نئی مروجہ تہذیب پر انگریزوں کی آمد کے اثرات کا جائزہ ہے۔ اس سارے عمل میں کوشش کی جائے گی کہ پنجاب کی ایک مرکزی فکر کو تلاشا جائے جو ان تمام ادوار میں دورانِ خانہ اس خطے کے لوگوں کے ذہنوں میں ایک ہی وقت میں پلتی اور کھلتی رہی اور یوں انہوں نے ہر نئے عہد، ہر نئے حاکم، ہر نئے فاتح کے اثرات کس طور قبول کئے اور مختلف رنگوں کے امتزاج سے کیا صورت پیدا ہوئی۔ خود اسلامی ثقافت کو اپنے آغاز، مقبولیت اور استحکام کے فوراً بعد نامناسب اور ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا، جنہوں نے اس کے عمومی اور خصوصی مزاج پر بہت اہم اثرات مرتب کئے۔ اس سلسلے میں ٹ۔ ج دو بوائر کی اس طویل رائے کو دیکھنا، ایک سمت کے تعین میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

> ''مدینہ پہلے چار (خلیفہ) رسولؐ کے جانشینوں کا دارالسلطنت تھا لیکن محمدؐ کے شجاع داماد علیؓ اور ان کے بیٹے شام کے ہوشیار عامل معاویہ کے مقابلہ میں مغلوب ہو گئے، اُس وقت سے فرقہ اہل تشیع (پیروانِ علی) کی زندگی تاریخ میں شروع ہوتی ہے۔ اس فرقے نے بڑے بڑے نشیب وفراز دیکھے۔ کبھی یہ بالکل مغلوب ہو جاتا تھا اور کبھی ایک آدھ جگہ غالب بھی آ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آخرکار 1506ء میں شیعوں کی سلطنت ایران میں قائم ہونے کے بعد سنیوں اور ان کی دائمی نزاع کا خاتمہ ہوا۔ دنیاوی طاقت کے خلاف جنگ وجدل میں شیعوں نے ہر حربے سے جو ان کے امکان میں تھا، چنانچہ علم سے بھی کام لیا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں ان میں سے کسانیہ اُٹھے جو علی اور اُن کی اولاد کو مافوق البشری علم باطن کا حامل سمجھتے تھے۔ بقول اُن کے یہ علم تھا جس نے وحی خداوندی کے اصل منشاء کی توضیح کی۔ لیکن یہ علم بھی قرآن کے ظاہری الفاظ کی طرح اپنے معتقدوں سے اس بات کا طالب تھا بے چون وچرا حاملانِ اسرار کی اطاعت کریں اور وہ جو کچھ کہیں اُس پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آئیں۔ معاویہ کی فتح کے بعد جس کی بدولت دمشق اسلام کا دارالسطنت بن گیا۔ مدینہ کی اہمیت محض ذہنی حیثیت سے باقی رہ گئی۔ اُسے اس پر اکتفا کرنی پڑی کہ ایک حد تک یہودیت اور عیسائیت کے زیراثر فقہ اور حدیث کی تدوین کرے لیکن دمشق میں بنی اُمیہ (441ء تا 750ء) دنیاوی مہمات اور لشکرکشی کرتے رہے۔ ان کے زیرحکومت سلطنتِ اسلام بحر اوقیانوس سے ہند اور ترکستان کی سرحد تک اور بحرِ روم سے کوہِ قاف اور قسطنطنیہ کی فصیلوں تک پھیل گئی لیکن یہی اس کی وسعت کی انتہا بھی تھی۔ عربوں کو اب دُنیا کی قوموں کی سرکردگی حاصل ہوگی۔ انہوں نے ایک فوجی عمائدی حکومت کا نظام قائم کیا اور سب سے اہم ثبوت اس کے اقدار کا یہ کہ مفتوح قوتوں

نے جن کا تمدن بہتر اور قدیم تھا۔ فاتحوں کی زبان اختیار کرلی۔ عربی زبان مذہب وحکومت اور علم وشاعری کی زبان بن گئی، درآنحالیکہ اعلیٰ سرکاری اور فوجی عہدوں پر عرب مامور تھے۔ علوم وفنون کی تحصیل کی ابتداء غیر عرب اور مخلوط النسل لوگوں کیلئے چھوڑ دی گئی۔ شام میں لوگ عیسائی مدارس میں تعلیم پاتے تھے لیکن ذہنی تعلیم کا مرکز کوفہ اور بصرہ تھے جہاں عرب، عیسائی ایرانی مسلم، یہودی اور مجوسی ایک دوسرے سے ملتے تھے، جن مقامات پر صنعت وحرفت کو فروغ تھا، وہاں ایرانی اور مخلوط مسیحی یونانی اثرات سے اسلام میں علوم دُنیا کی داغ بیل پڑی''۔[۴]

اس پورے اقتباس سے اتفاق ناممکن حد تک مشکل ہے کہ معروضی حقائق سلطنت اسلام کی جغرافیائی اور نظریاتی حدود کے سلسلے میں خاصے مختلف ہیں اور خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں اسلامی سلطنت کی حدیں دور دور تک پھیل چکی تھیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مدینہ کبھی بھی محض ذہنی سطح تک اہم نہیں رہا۔ بہرحال یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اسلام یا قرآن اپنے پیروکار کو اَندھی تقلید کا سبق نہیں دیتا۔ لیکن اس اقتباس کی اہمیت یوں ہے کہ خطۂ عرب میں پیغمبر اسلامؐ کی عطا سے تشکیل پانے والا تمدنی اور ثقافتی نظام کچھ ہی عرصہ بعد عیسائی، یہودی اور دیگر تہذیبوں اور تمدنوں کے ساتھ نبردآزما ہونے لگا اور خطۂ عرب کے بعض علاقوں میں اس کی حالت وہ نہ رہی تو محمد بن قاسم کی ہندوستان آمد کے بعد اس خطۂ میں پھلنے پھولنے والے اس نظامِ حیات نے یہاں کے مقامی رنگ، ثقافت اور تمدن کے ساتھ کس طرح میل ملاپ رکھا ہوگا اور اُس کی اصلی اور خالص حالت کس طرح برقرار رہی ہوگی؟ یہی ہمارے اس مطالعے کا پہلا سوال ہے کہ اس نظام کی یہاں آمد پر بدھ مت ہندومت کے زیر اثر منظّم شدہ معاشرہ میں ہندوی اور اسلامی، تہذیبی اور ثقافتی ادغام کے اثرات کیا مرتب ہوئے ہوں گے اور اگر اسلامی تاریخ تہذیب کو اس خطہ میں قطعی اور آخری تہذیبی آغاز تسلیم کربھی لیا جائے تو اُس سارے تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی سرمائے کا کیا ہوگا جو دراوڑی اور آریائی ادوار میں اس علاقے میں پھلا پھولا اور جس کے اثرات اور وجود سے کسی طور انکار ممکن نہیں ہے۔

> ''ہند و پاکستان کی دراوڑی قوم نے جو اساطیر مذہب اور مابعد الطبیعات پیدا کی وہ ہندو دیومالا کی منظّم شکل تھی، جس نے آریاؤں کے آنے تک اپنی جڑیں پورے برصغیر میں پھیلا دی تھیں۔ اس قوم نے دیوی دیوتاؤں اور پوجا پاٹ کا ایک پیچیدہ نظام پیدا کیا، جس کے ساتھ ہی قربانیوں کی رسم بھی شروع ہوئی اور دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کیلئے انسانوں تک کی قربانی پیش کی جانے لگی۔ یہ دور موسیقی، سنگ تراشی، مصوری، رقص، بت گری اور برتن سازی میں بہت ترقی پر تھا''۔[۵]

پنجاب کا مطالعۂ دو الگ الگ خطوں کی صورت میں کرنا ہمارے موضوع کا حصہ نہیں اور نہ ہی اس خطے کے ادب پر ان اثرات کو اس نوع کے عمل سے جانچا پرکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ تقسیم سے پہلے اور بعد کی دو حالتوں میں اس خطے کے عمومی واختصاصی حالات موجودہ سرحدی تنظیم کے دونوں اطراف میں ایک جیسے نہیں رہے اور اس کی ایک بڑی وجہ اس کے عوام کے مابین ثقافتی وتمدنی تضاد ہے، یوں ''ادب'' اور ''تاریخ'' کے سنجیدہ تجزیہ کار ان دوخطوں کا مطالعۂ الگ الگ معیارات پر کریں گے کیونکہ ان کے تہذیبی وسماجی مزاجوں کی استواری بہت حد تک متوازی حالات میں ہوئی ہے، جس کا تفصیلی ذکر آگے کیا جائے گا لیکن اجمالاً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اپنے نظامِ حیات میں یہ دونوں خطے زمین سے وابستہ ذرائع سے استفادہ کرتے ہیں اور

دونوں کے ہاں زمین اور اُس کی ملکیت کا نظام مختلف ہے اور اس کی بنیادی اور اہم وجہ بھارتی پنجاب میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہے جس نے انفرادی واجتماعی زندگی پر مختلف اثرات مرتب کئے جبکہ مغربی پنجاب میں آج بھی یہ جاگیردارانہ نظام اپنی اچھی اور بُری شکلوں کے ساتھ موجود ہے جو اس خطے کی تہذیب، ثقافت اور باہمی میل جول پر نہایت مختلف قسم کے اثرات مرتب کرتا ہے۔

اس خطۂ زمین میں ہونے والی بودوباش اور طرز حیات کے اولین تاریخی نقوش آریوں کی آمد سے ملتے ہیں۔ جب انہوں نے اس گوشۂ ارض پر آکر اپنے قیام کے دوران دنیا کی قدم ترین مذہبی کتاب ''رگ وید'' تصنیف کی۔ اس مذہبی اور کسی حد تک تاریخی کتاب میں خال خال ارضِ پنجاب کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ اس قدیم تصنیف میں ''سپت سندھو'' (Sapta Sindhu) نام کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ درحقیقت یہ نام سنسکرت زبان کے دو الفاظ ''سپت'' (سات) اور ''سندھوا'' (دریا) سے مل کر بنا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ نام بالعموم سات دریاؤں کے مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے البتہ بعض مقامات پر اس نام کو ''سات دریاؤں کی زمین'' اور ''ملک'' کے نام کے طور پر بھی استعمال میں لایا گیا ہے۔ رگ وید کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

رگ وید کے منڈل نمبر 1 کا گیت نمبر 23 یوں ہے:

"Indra Kiled the 'drgaon' ritha, son of Danel, the first born of vitra`s and ahi`s and disclosed the water and cleft the channels of the mountains torrents and released the Sapate - Sindhu or Seven rivers".[6]

اسی طرح کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں جس سے اس سرزمین یا سات دریاؤں کے محل وقوع کے حوالے سے کچھ اہم نشانات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

"These seven sivers or Sapte-Sindhu could have come out only from the country to the north of Northern Punjab or from Kashmir. These rivers could not have enanated from the Burmese mountains or the Deccan Plateau moontain reanges".[7]

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سات دریاؤں یعنی ''سپت سندھو'' کا منبع ومرکز پنجاب کے شمالی علاقے یا پھر کشمیر ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ان دریاؤں کا منبع برما کے پہاڑی علاقہ جات یا دکن کی سطح مرتفائی پہاڑی سلسلے فطری جغرافیائی صورتحال کے مطابق نہیں ہو سکتے لہٰذا کشمیر اور پنجاب کے شمالی علاقے اس صورتحال کیلئے موزوں ہیں۔

"A more appropriate name, in fact, from the geographic and historic standpoint, is Sapta-Sindhu, "land of the seven rivers" which was given to the country by the Rigvedic Aryans. This is the earleiest namet that is

known to have been used for the Punjab, and is expressive of the country watered by the great rivers Indus and its famous thibutaries on the east and the west".[8]

قاسم کی فتح سندھ (93ھ/ 712ء) کے ایک سال بعد 94ھ (713ء) میں ملتان بھی عربوں کے قبضے میں آ گیا۔ اس طرح جنوبی پنجاب میں بھی اسلام کے ثقافتی اور تہذیبی اثرات کی راہ ہموار ہوگئی۔ اس وقت پنجاب کے ان علاقوں میں ہندو اور بدھ مذاہب کے پیروکار کثرت کے ساتھ آباد تھے، لہٰذا جب اس علاقے میں اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تو عقیدے اور آداب معاشرت میں اختلافی پس منظر کی وجہ سے یہاں کے تمدن وثقافت میں ایک واضح تبدیلی آنا شروع ہوگئی جس نے آگے چل کر اس علاقے کے عمومی اور خصوصی مزاجوں کے تعین میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرامطہ اور اسماعیلی عرب ضرور تھے مگر انہیں دیگر مسلک کے مسلم عناصر اور صوفیاء کے فکری اور عملی نظام کی مزاحمت کا سامنا رہا۔ اس ساری تبدیلی کی بڑی وجہ مسلمانوں کا رواداران رویہ اور انسانیت سے محبت تھی جس نے اس علاقے کے لوگوں کے نظریہ حیات اور زندگی کے مختلف شعبہ جات کے متعلق ان کے خیالات و افکار میں نئی طرح ڈالی۔ مسلمانوں کے اس علاقے میں مستقل قیام کے باعث یہاں کے بہت سے ہندو اور دوسرے مذاہب کے لوگ مسلمان ہو گئے اور یوں عرب ممالک کی اسلامی طرزِ زندگی سے مختلف یہاں ایک نئے اسلامی طرز زندگی نے جنم لیا جس میں مقامی روایت، آداب، اطوار، زبان اور معاشرت کے اثرات بھی نہایت تیزی کے ساتھ قبول کئے گئے۔ اور شعوری اور لاشعوری سطح پر اس اسلامی نظریۂ حیات اور دین کی پرورش کا موقع نہیں ملا جس کی پرداخت صحرائے عرب میں ہوئی۔ بلکہ یہاں تعمیر پانے والا دینی و اخلاقی ڈھانچہ اسلامی تعلیمات اور ہندوستانی تعلیمات کے باہمی میلاپ سے تشکیل پانا شروع ہوتا ہے جو وقت کے بہاؤ میں اپنی حالتیں بدلتا آج ایک بھرپور رنگ کے ساتھ موجود ہے جس میں اسلامی فکر کے ساتھ ہندوی، بدھ اور دیگر غیر اسلامی ہندوستانی تعلیمات کے اثرات کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اس سارے عمل میں مقامی لباس، خوراک، زیورات، رسم ورواج، عقائد و توہمات پر مسلمانوں کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ امراء میں زرق برق لباس زیب تن کرنے کا رواج ہونے لگا۔ مسلمانوں نے یہاں کلاہ، کوٹ اور شلوار کو رواج دیا جبکہ ہندو پگڑی اور دھوتی پہنتے تھے۔ ہندوؤں کا لباس مسلمانوں کے لباس کی نسبت سادہ اور مختصر ہوتا تھا۔ مسلمان ذات پات کے نظام سے آزاد تھے لیکن ہندو ذات پات کے اثرات بہرحال ان پر مرتب ہوئے اور آج تک اس علاقے کے لوگ ہندو ذات پات کے نظام میں بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی دیکھا دیکھی انہوں نے میلے ٹھیلے بھی منانا شروع کر دیئے اور مقامی مشاغل مثلاً چوگان، شطرنج، جواء، شکار، شراب، رقص، موسیقی، رنگ بازی وغیرہ میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس ساری صورتحال نے پنجاب میں انفرادی اور اجتماعی طرز زندگی اور کرداری خصائص کی ترکیب کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کیا اور آگے چل کر ترتیب پانے والا معاشرہ ان سب رنگوں کے اثرات سے بھرا ہوا ہے۔ متحدہ پنجاب کے جغرافیائی ڈھانچے کو ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں:

’’سرزمین پنجاب کا نام (پنج آب) اور اس خطے میں اُردو (ہندوی) کا آغاز اسلامی عہد سے وابستہ ہے۔ پنجاب

کے سیاسی جغرافیے میں مختلف تاریخی ادوار میں تغیر وتبدل ہوتا رہا ہے لیکن اس کا طبعی محلِ وقوع دریائے سندھ (اٹک) سے دریائے جمنا کا درمیانی علاقہ ہے جو شمال میں کشمیر اور شمال مشرق میں شوالک کی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور یہ پہاڑی سلسلے کوہ ہمالیہ سے پیوست ہیں۔ ان پہاڑوں سے اُتر کر پنجاب کا میدانی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جسے پانچ دریا جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج سیراب کرتے ہیں۔ ان دریاؤں کے منابع کوہ ہمالیہ میں ہیں اور پنجند کے مقام پر یہ دریا سے مل کر آگے دریائے سندھ میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہیں سے پنجاب کی جنوب مغربی حد ختم ہو جاتی ہے۔ جنوب میں راجھستان (بیکانیر، جیسلمیر، راجپوتانہ) کا صحرائی علاقہ ہے''۔[۹]

آریاؤں کے توسط سے متشکل ہونے والے تہذیبی ڈھانچے کو ٹیکسلا کی دریافت کردہ تہذیب میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے اس سفر میں ہم زیادہ دور تک نہیں جا سکتے اور اس سرزمین پر مسلمانوں کی آمد کو بنیاد بنا کر بات کو آگے پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''سنۂ ایک ہزار عیسوی کے اختتام پر ان علاقوں میں اسلامی تہذیب کا عمل دخل شروع ہوا''۔[۱۰]

اس خطے میں اسلام اور مسلمانوں کی آمد نے یہاں کے ثقافتی وتہذیبی ورثے کو نابود کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس نئی تہذیب نے پُرانے آثار کو اپنے اندر جذب کر کے ایک نئی اور زندہ تہذیبی علامات کے طور پر خود کو متعارف کرایا اور یہی دو تہذیبوں کا امتزاجی ڈھانچہ عہد موجود میں بھی اس خطے میں جاری وساری ہے بلکہ اپنی ایک الگ شناخت اور اہمیت کا حامل ہے۔ مہم جوئی اور خطرات پسندی اس سرزمین کے باسیوں کا طُرہ ہے۔ یہ لوگ اپنے کردار میں بہادری وجرأت کے ساتھ ساتھ مضبوط اعصاب اور قوی معدے جیسی امتیازی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ پنجاب کا رقبہ وقت کے بہاؤ کے ساتھ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ پہلے ہم متحدہ پنجاب کے بارے میں بات کرتے ہیں تو سید محمد لطیف کے مطابق:

''اپنی جاگیری ریاستوں کے ہمراہ پنجاب کا علاقہ ایک لاکھ چوالیس ہزار چار سو چھتیس مربع میل رقبہ پر محیط ہے''۔[۱۱]

اس صوبے کا نظام بہت سی تنقیدی ومتوازی آراء کا حامل رہا ہے، خاص کر اس سوال کے تناظر میں کہ 'کب اور کس طرح' اس سرزمین کو 'پنجاب' کے نام سے موسوم کیا گیا اور اس کے کون کون سے عوامل تھے اور اگر اس حوالے سے تحقیق کے دائرہ کار کو وسیع کیا جائے تو مختلف نکتۂ نظر اور آراء کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن ان آراء پر غور سے پہلے اس صوبے کے وقوع کے حوالے سے ڈاکٹر سید محمد لطیف کی یہ رائے دیکھ لیں:

''یہ 27 ڈگری 39 فٹ اور 35 ڈگری 2 فٹ عرض شمالاً اور 29 ڈگری 35 فٹ اور 78 ڈگری 30 فٹ طول شرقاً کے درمیان واقع ہے''۔[۱۲]

تو گویا یہ پنجاب کا طول وعرض بلد ہے۔ اب دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا اس صوبے کے متعلق کیا کہتا ہے:

"The First known use of it occurs in the writting's of the Muslim Traveller, Ibn-Buttath (q-v) who visited India in the 14th Century".[13]

یوں اس انسائیکلو پیڈیا کے مطابق لفظ پنجاب پہلی بار ابن بطوط نے اپنے ہندوستان کے سفرنامے میں استعمال کیا جو کہ 14

صدی عیسوی میں یہاں آیا۔مفتی غلام سرور لاہوری اس معاملے کو یوں بیان کرتے ہیں:

''پنجاب اس ملک کا نام اکبر کے وقت سے قرار پایا تھا''۔[۱۴]

انسائیکلو پیڈیا اور مفتی غلام سرور کی رائے میں لفظ پنجاب کے آغاز میں، زمانی بعد بہت زیادہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا اِسے چودہویں صدی میں ابنِ بطوط کے سفرنامہ سے تشکیل شدہ صورت میں بیان کرتا ہے جبکہ مفتی غلام سرور اِسے عہد اکبر سے موسوم کرتے ہیں جو 1570ء کے بعد کا وقوعہ ہے۔یعنی سولہویں صدی کے آخری عشرے، یوں ان دو آراء سے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ آخر درست رائے کون سی ہے جسے بنیاد سمجھ کر''پنجاب'' کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کیا جائے۔اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ پنجاب کا جغرافیائی منظر نامہ متحدہ پنجاب کو پیش کر رہا ہے۔ جو کہ اس مقالے کا عمومی حصہ ہے جبکہ آئندہ مغربی پنجاب کے طرزِ حیات پر گفتگو کی جائے گی۔جس میں خطۂ پوٹھوہار، سنٹرل پنجاب، جنوبی پنجاب کے علاقے شامل ہیں اور جنہیں اب پاکستانی پنجاب کی صورت میں شناخت کیا جاسکتا ہے۔ یوں ہمارا مطالعہ پنجاب کے شمالی جنوبی علاقہ جات کا احاطہ کرے گا۔ڈاکٹر محمد باقر بھی اس نام اور اس کی تاریخی حیثیت کے متعلق گونا گوں حالات کا شکار ہیں اور لکھتے ہیں:

''قیاس کی اور بات ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا وہ علاقہ جو شرقاً غرباً انبالہ سے اٹک تک اور شمالاً جنوباً راولپنڈی سے بہاولپور تک پھیلا ہوا ہے اور جسے تاسیس پاکستان سے پہلے تک پنجاب کے نام سے پکارا جاتا تھا، اپنے اس نام سے بہت دیر سے معروف ہیں۔ مثلاً راقم کی اطلاع یہ ہے کہ جہانگیر سے پہلے (1014ھ/ 1605ء) اس علاقے کو کبھی اس نام سے یاد نہیں کیا گیا۔ جہانگیر ہی غالباً وہ پہلا شخص ہے جو اپنی توزک میں اس علاقے کو اس نام سے یاد کرتا ہے اور یہ نام''پنج'' اور''آب'' یعنی پانچ پانی جس سے مراد پانچ دریا لئے جاتے ہیں، فارسی کے دو کلمات سے مرکب ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا یہ نام کسی فارسی دان نے ہی رکھا ہوگا ورنہ عہدِ قدیم میں یہ نام کہیں دستیاب نہیں ہوتا''۔[۱۵]

ڈاکٹر صاحب نے دو اہم نکتے اٹھاتے ہیں ایک یہ کہ عہد جانگیر 1605ء سے پہلے یہ نام نہیں سنا گیا۔تو گویا ابنِ بطوط کا سفرنامہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا اور دوسرا یہ کہ اس سرزمین کو یہ نام کسی فارسی دان نے دیا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب توزکِ جہانگیری کو بنیاد بنا کر یہ رائے دے رہے ہیں جبکہ مفتی غلام سرورلاہوری کا خیال تھا کہ یہ لفظ پہلی مرتبہ عہد اکبری میں مستعمل ہوا اور عہد اکبر سولہویں صدی کے وسط سے آغاز پاتا ہے جبکہ عہد جہانگیری 17 ویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی شروع ہوتا ہے۔ یوں اب تک ہمارے سامنے لفظ''پنجاب'' کے آغاز کے حوالے سے تین آراء سامنے آئی ہیں اور یہاں اس لفظ کے استعمال سے مُراد بطور''صوبائی نام'' کے ہے۔ پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے اُردو دائرہ معارفِ اسلام کچھ یوں رائے دیتا ہے:

''یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے کیلئے پنجاب کا نام دورِ مغلیہ سے قبل قدیم ماخذ میں کہاں کہاں سے آیا ہے۔ عطا الملک جوینی کی تصنیف''تاریخ جہانگشاہی'' میں جس پنجاب کا کر ذکر آیا ہے وہ حدود بلخ و ترمذ میں دریائے جیحوں کے کنارے ایک مقام ہے۔اسی طرح منہاج سراج کی''طبقات ناصری'' میں پنجاب سے مراد دریائے سندھ

کے پانچ معاون (باسلطان قطب الدین ایبک اور اپجند وپنج آب سندھ معاف افتاد) اور دریائے پنجند یا خود دریائے سندھ مراد ہے (ودرہمیں ماہ ملک ناصر الدین قباچہ از حصار بھکر خودرا در پنجاب غرق کردم) ''تاریخ بیہقی''، ''کتاب الہند''، ''تاریخ فیروز شاہی'' وغیرہ میں اس صوبے کے مختلف علاقے اپنے مرکزی شہروں مثلاً سرہند (سرہند) جالندھر، لاہور، دیپالپور اور ملتان وغیرہ سے منسوب کئے گئے ہیں۔ عہد مغلیہ میں اور اس سے پہلے پنجاب کے مشمولہ علاقوں کو صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ البتہ اکبر کے زمانے سے پنجاب کا نام بکثرت اور بالعموم استعمال ہونے لگا۔ ابوالفضل نے اپنی تصانیف ''آئین اکبری''، ''''اکبر نامہ'' اور مکاتیب میں متعدد موقعوں پر پنجاب کا ذکر کیا ہے اور کشمیر کو اس سے الگ قرار دیا ہے۔ اس کے بیان سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صوبہ لاہور ہی اصل پنجاب ہے۔ منشی سبحان نے اپنی کتاب ''خلاصۃ التواریخ'' میں پنجاب کی جو تفصیل دی ہے وہ مغلیہ دور کے نصف ثانی کے احوال کی نمائندگی کرتی ہے۔ منوچی شاہ جہاں اور اورنگزیب کے زمانے میں موجود تھا۔ پنجاب کو عملداری لاہور کا قائم مقام قرار دے کر لکھتا ہے کہ بھکر کے نزدیک سات دریا بہتے ہیں۔ ان میں سے پانچ عملداریٔ لاہور سے نکلتے ہیں۔ ان کا منبع سری نگر اور کشمیر کے پہاڑوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملداری لاہور کو پنجاب (پانچ دریاؤں کی زمین) کہا جاتا ہے''۔[۱۶]

درج بالا رائے پنجاب کے نام کے حوالے سے خاصی اہم اور معلومات افزاء ہے جس کو مزید تفصیلی صورت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ اسی قسم کی رائے عین الحق فرید کوٹی بھی دیتے ہیں:

''پنجاب کی اصطلاح غالباً اکبر کے دور سے پہلے تک رائج نہ تھی''۔[۱۷]

ان بیانات کی روشنی میں لفظ پنجاب (پنج + آب) کا بصورتِ نام و اصطلاح کے رواج کا زمانہ عہدِ جہانگیری 1605ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ساتھ ہی ان بیانات میں اُلجھاؤ اس قدر ہے کہ اس لفظ کی ابتداء اور نشوونما کے متعلق کوئی بھی حتمی رائے دینا خاصا مشکل محسوس ہوتا ہے لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پنجاب فارسی زبان کا لفظ ہے جو کہ دو لفظوں ''پنج'' اور ''آب'' سے مرکب ہے اور اس کے معنی ''پانچ دریاؤں کی سرزمین'' کے ہیں۔ گو اس خطہ کی جغرافیائی حدود امتدادِ زمانہ اور سماجی و سیاسی حالات و واقعات کے پیشِ نظر مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے لیکن یہ وہی علاقہ ہے جس کو عہد قدیم میں صوبہ ملتان اور صوبہ لاہور کے نام سے جانا اور پکارا جاتا رہا ہے۔

پنجاب میں سماجی وسیاسی حالات کو دو بڑے ادوار کی روشنی میں تشکیل دیا جا سکتا ہے اور بلاشبہ ان دو ادوار کے اثرات آج بھی پنجاب پر بڑے واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہی وہ ادوار ہیں جنھوں نے پورے پنجاب پر اپنے اثرات مُرتسم کئے۔ ان میں سے پہلا دور اس خطہ میں مسلمانوں کی آمد سے متعلق ہے جبکہ دوسرا دور اس ارض پر انگریزوں کی آمد اور حکومت کے متعلق ہے۔ پہلے ہم پہلے دور کے متعلق دیکھیں گے اور اس کے سیاسی، سماجی اثرات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ برصغیر پاک وہند سے مسلمانوں کا تعلق ان عرب تاجروں کے توسط سے قائم ہوا جو اپنی

بادبانی کشتیاں لے کر ساحلِ عرب سے سواحل ہندو چین تک روز وشب سفر کیا کرتے تھے اور اس مسافرت اور اس کے بدلے ہونے والے میل ملاپ سے صرف مال وتجارت کا ہی لین دین نہیں ہوتا تھا بلکہ اس باہمی سماجی عمل میں تہذیب وتمدن کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری وساری رہتا۔

"712ء میں محمد بن قاسم کی فتح دیبل مختصر عرصہ میں ملتان کی فتح پر مکمل ہوئی اور یوں مسلمان اس خطے پر اپنا اثر ورسوخ روز بروز بڑھانے لگے۔ اس بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ نے مسلمانوں کو نہ صرف عسکری سطح پر اپنی پیشکش کا موقع دیا بلکہ سماجی، معاشرتی اور اخلاقی سطح پر بھی مسلمانوں نے اپنے اثر ورسوخ کو نہ صرف روز بروز بڑھایا بلکہ اس مقبولیت اور توانائی کو قائم بھی رکھا۔ مسلمانوں نے اپنے اس اخلاقی نرم رویے کے ساتھ ساتھ جنگی حربے اور مہارت کو بھی مکمل خلوص اور بھرپور تیاری اور توانائی کے ساتھ استعمال کیا۔ مسلسل جنگ وجدل اور خونریزی کے بعد آخرکار پنجاب گیارہویں صدی کے ربع اول میں غزنوی سلطنت کا حصہ بنا اور یوں ایک تاریخ کا باب بند ہوا۔ جس کا تعلق دراوڑی عہد سے ہندوی عہد تک پھیلا ہوا ہے تو ساتھ ہی ایک نئے تاریخی باب کا آغاز ہوا۔ اس نوآمدہ اِسلامی طرزِ حیات اور فلسفہ وفکر نے آئندہ آنے والے وقتوں میں پنجاب کو تہذیب وثقافت اور علم وحکمت کا گہوارہ بنا دیا۔ اس نئے باب کو عہد اسلامی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ وہی عہد ہے جس نے ایک طرف اس خطے سے کفر وباطل کے سائے دور ہٹائے اور دوسری جانب ایسا نظامِ زندگی دیا جو اپنی مثال آپ ہے۔ اس عہد اسلامی کو صوبہ پنجاب کے تناظر میں چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غزنوی دور ۲۔ سلاطین دہلی کے عہد میں

۳۔ مغلوں کے زیرسایہ ۴۔ مغلوں کے زوال کے بعد، سکھا شاہی عہد میں"[۱۸]

مسلمان علماء وصوفیاء نے اس بجرہ زمین کو تبلیغ دین کیلئے منتخب کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے آستانے ہر خاص و عام کیلئے رشد وہدایت کا مرکز بنتے چلے گئے۔ یہاں یہ بات قابل غور اور ذہن میں رکھنے والی ہے کہ اس خطہ میں رسمی وغیر رسمی تعلیم کے باقاعدہ آغاز وارتقاء میں ان صوفیاء کی تعلیمات کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ان صوفیاء وعلماء کی طرف سے پیش کیا جانے والا ادبی سرمایہ بہ صورت شعر ونثر کسی طور کم اہم نہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"مشائخ میں سب سے پہلے شیخ اسماعیل یہاں آئے۔ ان کی آمد کا سال 395ھ م 1004ء ہے۔ جب لاہور ابھی سلطنت غزنیہ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی وفات 448ھ م 1056 تک وعظ وتبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کی مجلس وعظ میں ہزارہا آدمی مشرف بہ اسلام ہوتے تھے۔ شیخ عثمان ہجویریؒ (داتا گنج بخش) سلطان مسعود بن محمود غزنوی 1030ء تا 1040ء کے آخر عہد میں لاہور آئے اور درس وتبلیغ کا سلسلہ شروع کیا۔ ہزاروں لوگ آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوکر مشرف بہ اسلام آئے۔ ان میں رائے راجو بھی تھا جو مودود سلطان بن مسعود کی طرف سے لاہور کا نائب تھا۔ اِسے شیخ ہندی کا لقب ملا شیخ عزیز الدین مکی (پیر مکی شریف) 574ھ میں لاہور تشریف لائے اور یہیں رشد وہدایت میں مصروف رہ کر 612ھ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے بھی ہزاروں لوگوں کے سینوں

کو نور ایمان سے منور کیا۔ اس دور میں لاہور آ کر مقیم ہونے اور تبلیغ دین کی خدمت سرانجام دینے والے بزرگوں کے علاوہ سید احمد ترمذی (وفات 602ھ) سید یعقوب انجانی (وفات 604ھ) بھی قابل ذکر ہیں پنجاب کے علاوہ دوسرے علاقوں میں آ کر دین حق کی تبلیغ کرنے والوں میں سخی صفی الدین گازرنی (وفات 1007ء اوچ) شاہ یوسف گردیز (وفات 1152ء ملتان) سلطان سخی سرور، سید احمد (وفات 1181ء شاہ کوٹ، ڈیرہ غازیخان) قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے سرزمین پنجاب میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور یہاں اسلامی تہذیب ومعاشرت کی بنیادیں استوار ہونے لگیں۔ تاہم غزنوی عہد میں تبلیغ کا یہ دائرہ لاہور، ملتان اور چند دیگر قصبات تک محدود رہا۔ مشائخ کے بعد علماء اور شعراء کے کارناموں کی وجہ سے بھی غزنوی عہد تاریخ میں یادگار ہے''۔[۱۹]

ان بزرگانِ دین نے محض خشک وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب نہیں کیا بلکہ لوگوں کو اپنے کردار اور عمل کے زور پر دائرہ اسلام میں کھینچ کر لائے۔ پھر اسلام کو ایک آفاقی معاشرتی پیغام بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ نیز ایسی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کیا جو یہاں کے عوام کے مزاج اور پسند ناپسند کے موافق تھیں۔ اس علاقے میں مسلمانوں کی آمد کے بعد فن تعمیر کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انہوں نے مذہبی عمارات کے علاوہ محل، سرائے، مقبرے، باغات وغیرہ بھی تعمیر کرائے۔ مسلمانوں کا طرزِ تعمیر ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے بہ وجہ عقائد مختلف تھا۔ اس طرز تعمیر میں مقامیت کے اثرات کے علاوہ وسطی ایشیا اور مشرقِ وسطی کے طرزِ تعمیر کے اثرات بھی شامل تھے۔ ہندو عمارات کم رقبہ، تنگ محرابوں، ہموار چھتوں اور توڑے دار پل طرز پر تعمیر ہوتی تھیں جبکہ مسلمانوں نے کم فاصلوں پر ستونوں کے ساتھ ساتھ گنبد اور محرابوں کو استعمال کیا جس سے ایک نئی طرح کی تعمیر کاری کا نمونہ برصغیر پاک وہند میں فروغ پانے لگا۔ جس نے آنے والے وقتوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور مسلمانوں کے مخصوص علمی وفکری پس منظر کی وضاحت میں ایک استعارے کا کام کیا۔

محمود غزنوی کے زمانے تک آتے آتے اس خطہ میں مسلمان معاشرہ بنیادِ مضبوط کے ساتھ پرورش پانے لگا اور یہاں پر شادی بیاہ اور مرنے جینے کی رسومات میں واضح تبدیلیاں آنے لگی۔ نئے تہوار بھی مقامی رنگ کے ساتھ رائج ہونے لگے۔ یوں مسلم اور ہندو طرزِ حیات اس سارے معاشرے میں ایک ہی وقت میں رواج پانے لگا، اس کی ایک بڑی وجہ ایک ساتھ رہتے ہوئے دونوں اقوام ومذاہب کا الگ تھلگ رہنا تقریباً ناممکن تھا لہٰذا انہوں نے ایک دوسرے کو اپنانا اور ایک دوسرے کے تہوار مل جل کر منانا شروع کر دیئے۔ وادیٔ سندھ اور پنجاب سے لے کر دہلی تک اس ملاوٹ اور شیرینی کی سب سے بڑی وجہ صوفیاء اور بزرگانِ دین تھے جن کی مجالس میں ہر مذہب اور مکتب فکر کے افراد شامل ہوتے تھے۔ آگے چل کر ان کے مزارات بھی ہر قسم کے لوگوں کیلئے مرجع بن گئے۔ مسلم اقتدار سے قبل ہندوستان میں عورتوں کو کم تر سمجھا جاتا اور انہیں مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول اور تعلیم وتربیت کی سہولت بھی حاصل نہ تھی جبکہ نئے تشکیل پاتے معاشرے میں عورت کیلئے ایک مکمل اور الگ شناخت کا تصور ہموار ہونے لگا اور عورت کو بطور اکائی کے تسلیم کرنے کی روش اپنائی جانے لگی۔ مسلم فکری نظام نے ذات پات اور طبقاتی نظام کی بندش کا شکار ہندو معاشرے میں رواداری اور مساوات کے اُصول پر برابری کے نظام کو متعارف کرائی جو تازہ اور زندگی آمیز ہوا کے جھونکے سے کم نہ تھا۔

''انہوں نے یہاں بعض نئی صنعتیں قائم کیں اور پہلے سے مروجہ صنعتوں کی ترقی کیلئے اقدامات کئے۔ فیروز شاہ تغلق

کے زمانے میں راتبی اور غیر راتبی کارخانوں کی تعداد چھتیس تک پہنچ گئی۔ یہ صوبہ پارچہ بافی خاص کر ریشم کے کپڑے کی صنعت میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس دور میں سامانہ، سنام، کسرام، سرہند، دیپالپور، جالندھر، لاہور، ملتان مشہور صنعتی مراکز تھے"۔[۲۰]

مغلیہ عہد میں اس سارے علاقے میں تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی مثالی تھی۔ جس میں وسطی ایشیاء کا خون، ایران کا رنگ اور مقامی ذائقہ اپنی مکمل چاشنی کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تہذیب وثقافت بعض ہندوخصوصیات کی حامل بھی ہے اور اس میں اسلامی فکر وعقائد کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے لیکن نور جہاں کی پسند اور ذاتی دلچسپی نے اس ثقافت میں ایرانی رنگ کو غلبہ دے دیا۔ رنجیت سنگھ نے بھی اپنی سلطنت کے قیام اور رُسوخ کیلئے اسلامی ثقافت کو تحفظ فراہم کیا۔

اس سارے منظر نامہ میں جو کردار اس علاقے میں نمودار ہو رہا ہے وہ بیک وقت ہند ایرانی کلچر اور مزاج کا حامل ہے۔ وہ کردار مزدور کا ہو یا بادشاہ کا، مدرس کا ہو مولوی کا، کوچوان کا ہو یا خوانچہ فروش کا، مفتی کا ہو یا رقاصہ کا۔ یہ سب کردار ایک نئی ترکیب کے ساتھ اس کرۂ ارض پر اپنا وجود منوانے لگے اور یوں یہاں جاگیردار اور صنعتی اشرافیہ کے ساتھ ساتھ ایک متوسط طبقہ وجود پانے لگا، جس کی بنیادی ترکیبی مسافت یورپی نظامِ حیات اور انگلستانی طرز بود وباش سے متاثرہ تھی۔ اس نئے بنتے بگڑتے معاشرے نے ہندوستانی طرز فکر اور طرز حیات پر بہت گہرے اثرات مرتب کئے اور اس اجتماعی اثر اندازی کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس معاشرے کے اجزائے ترکیبی کی فرد فرد حیثیت پر بھی غور کیا جائے۔ اس نو تعمیر شدہ معاشرے کے ہر کردار کے اجزائے ترکیبی میں اسلامی عقائد کے ساتھ ساتھ ہندی اثرات موجود ہیں۔ اسی نوع کا مطالعہ ہمارے مقالے کا مغز ہے کہ کس طرح اس خطے کے کردار اس خطے کے عمومی مزاج کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں اور وہ کون کون سے عوامل ہیں جن کے اثرات بلاواسطہ یا بالواسطہ اس علاقے کے فرد پر مرتب ہوتے ہیں اور پھر اُن اثرات کا دخل اس خطے کی لسان اور ادب پر ہوتا ہے۔ ادبی اثرات ہمارے مطالعے کا اہم پہلو ہے جس پر کلیت کے ساتھ غور وفکر کرنے کیلئے، اس نوع کے ابتدائی مطالعہ کو اپنایا گیا ہے۔

چنانچہ جب اس علاقے میں اسلامی معاشرہ تشکیل پانے لگا (ہم اس نئے نظامِ حیات کو اسلامی نظامِ حیات کہہ سکتے ہیں) تو عقیدے اور آدابِ معاشرت میں اختلافی صورت کے باعث یہاں کے تمدن میں ایک انقلابی شکل پیدا ہونے لگی جس کی وجہ مسلمانوں کا رواداری رویہ اور انسانیت سے لگاؤ ومحبت تھی اور یوں یہاں کے لوگوں کے نظریۂ حیات اور زندگی کے مختلف شعبوں کے بناؤ سنگھار میں نئے رنگ داخل ہونے لگے۔ مسلمانوں کے اس علاقے میں قیام کے باعث یہاں سے ہندو اور بدھ مذاہب کے لوگ تیزی کے ساتھ مسلمان ہونے لگے اور اس طرح ہندوستانی معاشرے میں نامعلوم طریقے سے عرب واسلامی معاشرے کی روح دھیرے دھیرے داخل ہونے لگی۔ جس سے یہاں ایک نئے طرزِ زندگی نے جنم لیا۔ جس میں مقامی روایات، زبان ومعاشرت اور آداب واخلاقیات کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر اسلامی عقائد واخلاقیات اور روایات ومعاشرت کے باہمی ملاپ وادغام سے ایک نئے طرزِ زندگی نے جنم لیا۔ بعد ازاں ان علاقوں میں مسلمان حکمرانوں کے رفاعی وتمدنی کارناموں سے اسلام کی مقبولیت میں بیش بہا اضافہ ہوا اور مسلم طرزِ زندگی کی مقبولیت بھی عام ہونے لگی۔

"مسلمانوں نے یہاں اپنی حکومت کے قیام کے بعد مقامی ذات پات کی سختیوں کے برعکس مساوات، رواداری،

اخوت اور علم وفضل کا معاشرہ قائم کیا جس میں مقامی لوگوں کیلئے بڑی اپیل تھی۔ نیز انہوں نے کسی کو بھی زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا بلکہ مسلمانوں کی مذہبی رواداری سے مقامی لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ یہاں تک کہ عربوں نے ملتان میں صدیوں سے قائم سورج مندر جُوں کا توں رہنے دیا بلکہ اس کی آمدنی کو منظم طریقے سے اس کے پجاریوں اور محافظوں پر خرچ کیا۔ یہاں حکمران بن کر مسلمانوں نے کسی کی کوئی بھی جاگیر یا جائیداد ضبط نہ کی۔ یہاں تک کہ برہمنوں کو جو حقوق مسلمانوں سے پہلے کی سلطنت کی طرف سے تھے وہ بحال رکھے۔ محمد بن قاسم نے مالگزای وصول کرنے کیلئے برہمنوں کو ہی مقرر کیا اور انہیں ہدایت کی کہ جہاں تک ہو سکے رعایا پر ظلم نہ کیا جائے اور ان کی سکت سے زیادہ ان سے محصول، لگان اور جزیہ وصول نہ کیا جائے''۔[۲۱]

مسلمانوں نے ارضِ پنجاب پر حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی مشفقانہ برتاؤ کیا۔ انتظامی و انصرامی امور کی انجام دہی کیلئے مقامی لوگوں کو تعینات کیا گیا۔ عدل وانصاف اور رواداری کو عام کیا گیا اور وہ طبقاتی تضاد جو صدیوں سے اس سرزمین پر رائج تھا، کا خاتمہ کردیا گیا۔ کیونکہ جو طبقاتی نظام اور فکر ہندو نظامِ حیات کا خاصہ تھا اور جس کے باعث معاشرے میں سماجی عدم اعتماد کو فروغ مل رہا تھا، اسلامی نظامِ زندگی اس کی یکسر مخالفت کرتا ہے اور آزادی، مساوات، برابری اور رواداری کا درس دیتا ہے جو کہ ہندو سماج کیلئے نیا بھی تھا اور خوش آئند بھی کہ یہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر محروم طبقات اور نچلی ذات کے لوگ اپنے حقوق کیلئے آواز بلند کر سکتے تھے۔ اس سارے عمل سے اس خطۂ کے لوگوں نے اسلامی زندگی کو اطمینان اور قریب سے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑی تعداد حلقۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔ اس حُسنِ سلوک سے اس علاقے کے لوگوں کی معاشرتی زندگی میں بھرپور تبدیلی آئی۔ توحید اس معاشرے کا بنیادی عنصر تھا۔ کھانے پینے کے آداب، حلال وحرام کی تمیز، لباس و پوشاک، پردہ غرض بہت سی چیزیں ان نووارد مسلمانوں کے وسیلہ سے یہاں متعارف ہوئیں۔ لباس میں دھوتی اور کُرتے کی بجائے شلوار، کرتہ، عمامہ دار پگڑی اور کئی دوسرے ملبوسات متعارف ہوئے۔ انفرادی کھانے کے بجائے اجتماعی مجالسِ طعام کا انتظام ہونے لگا۔ مسجد ومدرسہ یہاں بالکل نئے اداروں کے طور پر جاری ہوئے۔ انفرادی عبادت گاہوں کی جگہ اجتماعی عبادت گاہوں کا شعور پنپا۔ فنِ تعمیر میں تنگی تاریکی کی بجائے وسعت، فراخی اور روشنی آئی۔ مذہبی تعصب اور تنگ نظری کی جگہ وسعت نظری اور حلم وبرداشت نے لے لی۔ مساوات، اخوت اور بھائی چارے کا درس عام ہوا اور یوں ملتِ اسلامیہ کا لگایا ہوا پودا اس علاقے میں نہایت تیزی کے ساتھ پروان چڑھا اور پھلنے پھولنے لگا۔

''مسلمانوں کی کثیر تعداد جو تجارت، فوجی، سرکاری خدمت کی غرض سے پنجاب میں ان ایام میں آباد تھی، پنجاب ہی کو اپنا وطن تصور کرنے لگی تھی۔ لاہور اس عہد کے مسلم ہندوستان کا مرکز بن گیا تھا۔ پنجاب ان کی نظر میں ایک فتح کردہ ملک نہیں تھا بلکہ وہ اس پر وطن کی حیثیت سے نگاہ ڈالنے لگے تھے''۔[۲۲]

اسی طرح عہدِ غزنیہ میں لاہور پورے پنجاب کی علمی وادبی اور سیاسی وثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

''غزنوی دور کی معارف اور علم نوازی کی داستانیں زبانِ زدِ عام ہیں۔ اس عہد میں سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم وفضل کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے حکام کے درباروں میں علماء کی کثیر تعداد آنے لگی۔ اس زمانے میں بے شمار مسلمان خاندان دوسرے ممالک سے تلاشِ معاش، سرکاری ملازمت یا

تبلیغ دین جیسے مقاصد کیلئے لاہور میں آباد ہوگئے۔ مقامی باشندے بھی جوق درجوق مسلمان ہونے لگے اور یہاں ایک مسلم سوسائٹی وجود میں آئی''۔[۲۳]

پنجاب میں مسلمانوں کی آمد اور سکونت کے ساتھ ہی یہاں فنون کا ایک نیا باب کھل گیا۔مسلمانوں نے یہاں نئی نئی عمارات بنائیں۔ انہوں نے مذہبی عمارات کے علاوہ محل، مقبرے، سرائے اور باغات بھی تعمیر کرائے۔ مسلمانوں کا طرزِ تعمیر ہندوؤں کے طرزِ تعمیر سے خاصا مختلف تھا۔ اس میں مقامی اثرات کے علاوہ وسطی ایشیا اور مشرقِ وسطی کے اثرات بھی شامل تھے۔ ہندو عمارتیں کم رقبہ، تنگ محرابوں ہموار چھتوں اور توڑے دار پل طرز پر تعمیر ہوئی تھیں مگر مسلمانوں نے کم فاصلہ پر ستونوں کے ساتھ ساتھ گنبد اور محرابوں کو استعمال کیا۔

مسلمان بزرگوں کے توسط سے درس وتدریس کا نظام اس علاقہ میں رائج ہوا۔مسلمان فاتح تھے اور ایک عظیم الشان تہذیب وتمدن کے نمائندے بن کر یہاں آئے تھے۔جس سے عرب کا سوز اور عجم کا ساز مل کر ایک نیا اسلوب حیات متعارف کراتا ہے۔ یہ اس زمانے کی ترقی یافتہ اور برتر تہذیب تھی۔جس کے سامنے وحشی تاتاری بھی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔عربی، فارسی، ترکی زبانیں اور ان کا ادب اس تہذیب کا نمائندہ تھا۔ اس کے برعکس برصغیر صدیوں سے سیاسی، ذہنی،فکری انتشار میں مبتلا تھا۔ ہندو تہذیب طبقاتی اونچ نیچ کی وجہ سے پسماندگی کا شکار تھی۔ یہ تہذیب مسلمانوں سے قبل آنے والے نیم وحشی فاتحین کو تو اپنے اندر جذب کرتی رہی لیکن نئے مسلمان فاتحین کے سامنے اس تہذیب کا چراغ نہ جل سکا۔ یہ تہذیب توحید کے عقیدے کے ساتھ انسانی اخوت اور مساوات کا پیغام لے کر یہاں آئی تھی اور اس پیغام کے سب سے بڑے مبلغ مسلمان صوفیاء تھے۔ان صوفیاء کا کلام اور نثری تصانیف بیک وقت مذہبی خدمت کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی ترویج کا ذریعۂ بنے۔ سب سے اعلیٰ مثال شیخ علی بن عثمان ہجویری کی ''کشف المحجوب'' ہے جس نے علم وادب کی آبیاری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان بزرگوں نے محض خشک وعظ ونصیحت کے ذریعے لوگوں کو اسلام کی طرف راغب نہیں کیا تھا بلکہ ان لوگوں کو اپنے عمل وکردار کے زور سے مشرف بہ اسلام کیا۔ پھر اسلام کو ایک معاشرتی پیغام بنا کر عوام وخواص کے سامنے پیش کیا اور یہ سب اس طرح کیا کہ مقامی باشندوں کی نفسیات اور مزاج کے برعکس نہ ہو اور وہ کھلے دِل و ذہن کے ساتھ اس کو سمجھیں اور اپنی مکمل مرضی اور منشاء کے ساتھ اپنے روزمرہ اور معمولات کا حصہ بنائیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور یہاں کے مکینوں کے ساتھ میل جول اور بود وباش سے یہاں کے سماجی اور تہذیبی رویوں میں ایک انقلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی۔مسلمانوں کی آمد اور صوفیاء کرام کی خدمات سے قبل ہندوستان کی دیومالائی تہذیب وحدت پرستی، بنیادی انسانی اقدار اور سماجی و معاشرتی مساوات کے تصور سے ناآشنا تھی۔ بودھ تحریک کی اثر انگیزی اور بے پناہ مقبولیت کے باوجود برہمنیت کا دائرہ اثر کمزور نہیں ہوا تھا اور ذات پات اور سماجی اونچ نیچ ایسے تصورات سماج کی بنیادی فکر کا جزوِ لاینفک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کیلئے انسان تک کو قربان کردیا جاتا لیکن مسلمان بزرگ صوفیاء نے اس سرزمین کے پسماندہ عوام کو اسلام کی ان انسانی اور سماجی اقدار سے رُوشناس کرایا جو حقیقی اسلامی فکر کا ضروری جزو تھیں۔ ان صوفیاء نے اپنے کردار، عمل اور حُسنِ اخلاق سے ایک نئے تہذیبی اور تمدنی رویے کی بنیاد رکھی جو وحدت پرستی اور بلا امتیاز رنگ ونسل اور عقائد، انسان دوستی کی پیامبر تھی۔ مسلم صوفیاء کے نظریات اور تربیت نے ان کو دھرم سُدھار کا شعور دیا اور ہندو سماج نے پہلی مرتبہ کثرت پرستی کے فریب سے نکل کر

وحدت پرستی کی حقیقت کو اپنایا۔ اس ساری تبدیلی نے اسلامی اثرات کو بہت تیزی کے ساتھ قبول کیا اور ایک بالکل مختلف ذہنی فضاء قائم ہوئی، جس کے مجموعی عمل نے ایک ایسی ہندی اسلامی تہذیب کو تشکیل دیا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کا موجب ہوئی۔ اس سارے عمل کو اقتباس سے سمجھا جاسکتا ہے۔

''تیرہویں صدی میں حضرت نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو نے اس عمل کی تکمیل کی اور سولہویں صدی میں اکبر کے ہاتھوں اس کو عروجِ منصب حاصل ہوا۔ اس عظیم الشان سماجی وثقافتی انقلاب میں درباری سرکاری وسائل نے براہِ راست کوئی حصہ نہیں لیا تاہم اُنہوں نے محمود غزنوی سے شاہ جہاں تک اس میں کوئی مداخلت بھی نہیں کی''۔[۲۴]

پنجاب عام مشاہدے میں مکمل طور پر ڈھلانی میدان کی صورت میں ہے۔ اس کی سرحدیں شمال کے بلند قامت پہاڑوں سے جنوب کے خشک اور بے آب وگیاہ ریگستانوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس خطے کی ڈھلان باقاعدہ اور بتدریج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پہاڑی و بالائی حصے معتدل بلندی پر ہیں۔ مشرق میں کوئی علاقہ اس علاقے جیسی خصوصیات نہیں رکھتا۔ سیاح اس کے سرسبز و شاداب رستوں اور وسیع وعریض میدانوں سے گزرتا ہوا انتہائی بنجر اور خشک خار دار جنگلوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس خطے کی آب وہوا میں گرمی اور سردی میں شدت پائی جاتی ہے۔ ہمالیہ کے جنوبی نشیبی علاقے تک پھیلے خطے میں جنوب مغربی مون سون ہوائیں چلتی ہیں اور بارشیں کافی زیادہ ہوتی ہیں مگر ایسے علاقے جو پہاڑوں اور سمندر سے دور ہیں وہاں گرمی میں شدت ہوتی ہے اور نسبتاً بارشیں بھی کم ہوتی ہیں لیکن اس صوبے کی آب وہوا ہر موسم میں سارے ہندوستان سے مختلف اور ہمیشہ خوشگوار ہوتی ہے۔ ''عبرت نامہ'' کے مصنف مفتی علی الدین اس صوبے کی آب وہوا کو ہندوستان کے دیگر خطوں سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں اور اپنی مذکورہ تصنیف میں یوں لکھتے ہیں۔ یاد رہے اس کتاب کا سال تصنیف 1853ء ہے:

''آب وہوائی ایں ملک از سامان ربع سکون وسیاحان کوہ وہامون نحوی بہ سمع درآمدہ کہ اگرچہ لطافت ونزہت ایام منہار ملک ہدوستان را از دیگر بلا دربع مسکون بسیار خوشگوار و پسند غودہ اند، اما آب وہوای ملک پنجاب رازیادہ ازاں برگزیدہ وپسند نمودہ اند''۔[۲۵]

پنجاب کی آب وہوا کئی حوالوں سے متنوع اور خوشگوار خصوصیات کی حامل ہے اور اس کو ہندوستان کا باغ سمجھا جاتا ہے اور ان شمالی علاقہ جات کو دیکھنا سیاح کا خوابِ اول ہوتا ہے۔ ان شمالی علاقوں کو عبور کر کے جوں ہی جنوب کی طرف جائیں تو جنوب مغربی جانب ویران ریتلی سطح مرتفع جنوب، مشرق میں حصار کے ویرانوں پر نظر دوڑائی جائے تو عجیب وغریب مناظر چشم تماشا کے سامنے اُبھرتے ہیں۔ لامتناہی ویرانے، بیاباں، کھلے چٹیل میدان، گھاس پھوس اور اِکا دُکا جھاڑیوں کے ساتھ سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ دوآبوں کے مرکزی حصہ میں چراگاہیں اور سبزہ کی فراوانی کے باعث اعلیٰ نسل کے مویشی پائے جاتے ہیں۔ ایرانی و افغانی شعرا اس خطے میں آمد کے بعد واپس جانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے اور یہاں کے رہن سہن میں بہت جلد گھل مل جاتے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں فارسی زبان نے رواج پانے میں کوئی دیر نہیں کی اور علم وادب کا ایک نیا راستہ ہموار ہوا۔ عہد اسلامی میں لاہور، ملتان وغیرہ تعلیم وتربیت کا مرکز بن گئے۔

''عہد اسلامی میں لاہور، اوچ، ملتان اور سیالکوٹ جیسے شہر پنجاب میں تعلیمی خدمات کیلئے نمایاں حیثیت حاصل کر گئے تھے۔ سکھ اور برطانوی ادوار اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی لاہور اور جالندھر شہروں کی تعلیمی خدمات بڑی نمایاں رہی تھیں''۔[۲۶]

زبان و ادبیات کے میدان میں صوبۂ پنجاب نے جو خدمات سرانجام دیں، اس میں ہندوستان کا کوئی دوسرا صوبہ ہم پلہ نہیں۔ ہڑپائی تہذیب کی مہروں کی عبارتیں یہاں کے قدیم ترین رسم الخط کا نمونہ ہیں۔ اس زبان کو شناخت نہیں کیا جا سکا اور نہ ہی ان کے زمانے کا تعین ممکن ہو سکا ہے۔ اس سرزمین پر آریاؤں کے ویدک بھاشاؤں سے زبانِ سنسکرت نے جنم لیا جو آگے چل کر دُنیا کی عظیم ادبی زبان کر اُبھری اور عرصۂ دراز تک اعلیٰ علمی و ادبی زبان کے مرتبے پر فائز رہی۔

اس خطے کے شعر و ادب کی قرأت و تفہیم سے قبل اس کے معاشرتی پس منظر میں پرورش پانے والے کرداروں کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔ شعر کی دیوی تو اُمراء، نوابین اور اہل دربار پر آغاز سے ہی فریفتہ رہی لیکن نثری تصانیف اپنے آغاز سے ہی معاشرے، رسم و رواج اور عقائد و رسوم سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ شخصی کردار کو سمجھنے سے پہلے اس علاقے جو آج پاکستان کا حصہ ہے اور جس کا زیادہ تر علاقہ پنجاب اور وادئ سندھ پر مشتمل ہے کے لوگوں کے عقائد اور توہمات کے متعلق جانا جائے تاکہ کردار کے عمل اور فکری پس منظر کو شناخت کرنے میں آسانی رہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں کی اس آمد نے ہندوستانی معاشرے کو دو سطحوں پر بالخصوص متاثر کیا۔ ایک اسلامی تعلیمات کے ذریعے جنھوں نے ہندووانہ سماج کی بنیاد کو ہلا کر رکھ دیا اور ایک بہت بڑی تبدیلی پنجاب کے ہندو سماج میں اُبھرنے لگی۔ طبقاتی نظام، ذات برادری کی بنیاد پر عظمت و رفعت کے معیار بدلنے لگے اور برابری اور غیر طبقاتی نظام کیلئے راہ ہموار ہونے لگی۔ اس سارے عمل نے ہندو دھرم کے عقائد کو بھی بُری طرح متاثر کیا اور ساتھ میں اُس کے سماجی نظام میں بھی ایک بڑی تبدیلی کیلئے بنیادی پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ نووارد زبان فارسی اور بزرگانِ دین کی کتب اور تعلیمات نے ہندوستانی سماج کی مقامی بولیوں اور پورے نظامِ معاشرت کو نہایت بُری طرح متاثر کیا اور اس خطۂ میں زبان، ادب، رسم و رواج، عقائد، تعلیمات کی سطح پر ایک واضح تبدیلی رونما ہونے لگی، جس نے آگے چل کر ایک نئے معاشرے کو قائم کیا، جس کا معیار زندگی پہلے سے موجود دو انتہاؤں کے حامل نظام، جن میں سے ایک شاہانہ اور دوسرا شودر تھا، کی نسبت بہتر، اعتدال پسند اور اپنے مجموعی مزاج کے حوالے سے انسان دوست اور اسلام پسند تھا۔

اعتقادات و توہمات ان پڑھ لوگوں کی زندگی کی متاع بیش بہا ہوتے ہیں جو ان کیلئے ایک سطح پر مذہب ایسی اہمیت اور ضرورت اختیار کر جاتے ہیں۔ اکثر نیم خواندہ حضرات بھی رواداری اور عقلِ رسا نہ ہونے کے باعث ان عقائد و توہمات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

ان دو اقسام کے لوگ اپنی معاشرتی اور سماجی زندگی میں خواہ اُس کی نوعیت انفرادی ہو یا اجتماعی، ان عقائد و توہمات سے ہرگز ہرگز صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ ان معاشرتی اعتقادات و توہمات کی ذیل میں اساطیر بھی مذہبی روایات کا تکمیلی جزو بن کر سامنے آتے

ہیں، اسی لئے مذہبی اعتقادات اور رسوم کے ساتھ ان کا تعلق گہرا ہوتا ہے۔ ابتداء میں ان اساطیر کو فطرت اور کائنات کے مظاہر کی تفسیر کی صورت میں فروغ ہوا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مذہبی رسم ورواج کی شکل میں حُرمت اور تقدیس کا درجہ حاصل کرلیا۔ ہر معاشرے کے اپنے خاص اعتقادت اور واہمے ہوتے ہیں جن کی تشکیل میں جغرافیائی ماحول، مذہب، نسل، توہم اور سماجی سوچ سب مل کر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جو اپنے معاشرے کی اکثریت کو اپیل کرتے ہیں اور کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں جن کو لوگوں کی ایک بڑی تعداد رد کر دیتی ہے۔

پنجابی معاشرے میں اعتقادات و توہمات اور اساطیر بڑے منفرد، جاندار، حیران کن، اور متنوع ہیں۔ ان کی بنیادیں رموز کائنات کے علاوہ بدھ، عیسائی، ہندو، جین یہودی، مذاہب کے ساتھ ساتھ دین اسلام میں بھی نہایت گہرائی تک موجود ہیں۔ ان میں سے کئی خالص مقامیت کے حامل ہیں اور کئی ایسے ہیں جو اجنبی زمینوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کئی چینی، وسطی ایشیائی، ایرانی، عربی اور یورپی سرزمین سے ہجرت کر کے اس علاقے میں اپنے یقین رکھنے والے مہاجروں کے ساتھ آئے اور پھر اس معاشرے میں ایسے رچے بسے کہ گویا اُن کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔عشرت رحمانی کے خیال کے مطابق:

> ''پنجاب کے معاشرتی اعتقادات وتوہمات کو ایک طرح سے پاکستان ہی کے اعتقادات وتوہمات کہنا چاہئے۔ مذہبی اساس پر مبنی اعتقادات توہمات کو چھوڑ کر باقی اعتقادات وتوہمات پنجاب کے سبھی لوگوں کا سرمایہ ہیں۔ جن کے پس منظر میں مقامی اور غیر مقامی عوامل کارفرما ہیں۔ یہی حال سیکولر اعتقادات وتوہمات کا ہے۔ پنجاب میں قدیم زمانے سے لے کر اب تک جو اعتقادات وتوہمات اور اساطیر مروج رہے ہیں۔ وہ حسب ذیل اقسام کے ہیں۔

الف: پہلی قسم جو خالصتاً مقامی مگر غیر اسلامی مذاہب اور معاشروں سے تعلق رکھتی ہے۔

ب: دوسری قسم جس کا کلیتاً تعلق اسلام اور اسلامی معاشرے سے ہے۔

ج: تیسری قسم جو اسلامی، مقامی اور غیر ملکی اعتقادات وتوہمات اور اساطیر کی آمیزش سے پیدا ہوئی ہے۔

د: چوتھی قسم کے اعتقادات وتوہمات جن کا مذکورہ بالا تینوں قسموں میں سے کسی ایک کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں بلکہ یہ محض انسانی جہالت کا نتیجہ ہے او اس کی نوعیت سیکولر ہے''۔[۲۷]

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی نیا لباس ہفتے کے دن پہنا جائے گا تو وہ زیادہ چلے گا۔ مسلمان بروز جمعہ اور عیدین کے موقع پر نیا لباس پہننا بابرکت سمجھتے ہیں۔ نیا زیور اتوار کے دن پہننا اچھا سمجھا جاتا ہے کیونکہ عقیدہ ہے کہ اس دن پہنا گیا زیور کھونے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ اسی پس منظر میں یہ قول مشہور ہے کہ ''بدھ سینچر کپڑا، گہنا ایتوار'' یعنی'' نئے کپڑے ہفتہ اور بدھ کے دن پہنو اور نیا زیور اتوار کے دن''۔

پرندوں میں اُلو کو ویرانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ کسی مکان پر گدھ کا بسیرا بدنصیبی کی علامت جانا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص سانپ دیکھ لے تو اسے اپنے منہ سے لفظ سانپ نکالنے کے بجائے نرمی سے کیڑا کہہ دینا چاہئے۔ عقیدے کے مطابق ایسا کہہ دینے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور جنبش نہیں کرسکتا۔

اگر کسی حاملہ عورت کا سایہ سانپ پر پڑ جائے تو کہا یہ جاتا ہے کہ سانپ کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت ماں کے کمرے کی چھت پر کانٹے دار جھاڑیاں رکھ کر دی جاتی ہیں تا کہ کوئی بیمار کتا یا بلی چھت پار نہ کر سکے جو بدشگونی سمجھی جاتی ہے۔ جس بچے کو نظر لگ گئی ہو اس کے علاج کیلئے کچھ سوکھی مرچیں لیکر اس بچے کے سر پر وار کر اُن کو آگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر مرچوں کا دھواں آنکھ میں نہیں لگتا تو یہ بات یقینی سمجھی جاتی ہے کہ بچے کو نظر لگی ہوئی ہے۔ زلزلے کے بارے میں لوگوں کا عقیدہ عام یہ ہے کہ ہماری زمین سفید رنگ کے ایک بیل کے سینگ پر کھڑی ہے۔ جب بیل زمین اُٹھائے اُٹھائے تھک جاتا ہے تو وہ زمین کو دوسرے سینگ پر منتقل کرتا ہے جس کی وجہ سے زمین میں لرزش پیدا ہوتی ہے۔ جسے عرفِ عام میں زلزلہ کہا جاتا ہے۔ اگر دوپہر کے وقت سورج کے گرد ہالہ پڑ جائے تو لوگ قیاس کرتے ہیں کہ بارش آنے والی ہے یا بادشاہ کی موت۔

اگر ایک گھر میں ایک ہی وقت میں دو شادیاں خصوصاً لڑکوں کی ہوں تو کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کی شادی ٹوٹ جائے گی۔ کہا جاتا ہے کہ جوتی سمیت چارپائی پر چڑھنے سے سانپ چارپائی پر چڑھ آتا ہے۔ اگر اذان کے وقت کتے بھونکیں یا گیدڑ بولے تو کہا جاتا ہے کہ اذان دینے والا عیب دار انسان ہے اور گاؤں پر عذاب نازل ہونے والا ہے۔

پاکستان میں مشائخ کے مختلف مزار اور خانقاہیں عوامی طبقوں پر بڑی مضبوط گرفت رکھتے ہیں۔ ان کے مرید یا پیروکاران سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ ووٹ ڈالتے وقت غیر جانبدار رہتے ہیں اور اگر پیر نے حکم دیا ہو تو پھر وہ والہانہ جذبے سے ووٹ ڈالتے ہیں۔ پاکستان میں پیروں کا اثر ورسوخ اب بھی بے حد ہے۔ پیر کو روحانی شخصیت کا درجہ حاصل ہے۔ بچوں کی پیدائش، شادی بیاہ اور موت کی رسوم میں پیر کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ مرید اور عقیدت منداپنے ذاتی معاملات میں پیر کی رائے کو صائب سمجھتے ہیں۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ایشیا اور افریقہ میں نوآبادیاتی نظام کے قیام، رسوخ اور عمل داری میں وہاں کے مقامی طبقہ اعلیٰ کا کردار بے حد اہمیت کا حامل رہا ہے اور شاید یہ بہت بڑی اور اہم وجہ ہے کہ اقوامِ یورپ ان وسیع رقبوں اور بڑی بڑی آبادیوں پر اپنے چند سپاہیوں اور منتظمین کی مدد سے کامیابی کے ساتھ حکومتی کرتی رہی ہے۔ رونلڈ رابنسن کے مطابق:

> ''نوآبادیاتی انتظامیہ کے ذمے اہم ترین کام مقامی بااثر افراد کا کھوج لگانا اور ان کی حمایت کا حصول ہوتا تھا اور یہی نوآبادیاتی حکومتوں کی کامیابی کا اہم ترین راز بھی تھا۔ اس حمایت کے عوض نوآبادیاتی حکومتوں نے بااثر افراد کی ہر ممکن معاونت ودستگیری کی نیز تمام تر حکومتی پالیسیاں انہی کے کمرشل اور زرعی مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئیں کیونکہ امن عامہ کے قیام کیلئے ان افراد کی حمایت استعماری قوتوں کیلئے اشد ضروری تھی''۔[۴۸]

یہ بات ہماری توجہ کا ایک بہت اہم امر کی جانب مبذول کراتی ہے اور اور ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خطہ میں انگریز راج کن بنیادوں پر قائم ہوا اور پھر نمو پا کر ایک مضبوط درخت بن گیا اور اس سامراجی درخت کی پرورش و پرداخت میں ہندوستانی اشرافیہ نے کوئی کسر باقی نہ اُٹھا رکھی جس کے نتیجہ میں غلامی کا طوق ایک صدی کے دائرے کو بھی پھلانگ گیا۔

وسطی پنجاب کثرتِ آبادی کا شکار ہے۔ یہاں پر زمین چھوٹے چھوٹے مقامات کی صورت میں کاشت کی جاتی ہے لیکن

لاہور کے کچھ علاقوں میں بڑی زمینداریاں بھی تھیں۔ وسطی میدانوں کے جنوب مشرقی اور شمال مغربی علاقے بے آب وگیاہ اور افلاس زدہ تھے، جنوب مشرقی علاقوں میں روہتک اور حصار جیسے قحط کے مارے ہوئے اضلاع موجود تھے جبکہ شمال مغرب میں ملتان اور جھنگ کے اضلاع تھے جہاں زمین ریتلی تھی اور ان علاقوں میں بارش بھی خاطر خواہ نہ ہوتی۔ آب رسانی کے وسائل کی عدم موجودگی میں ملتان اور جھنگ میں زیادہ تر علاقے بے آباد اور ویران تھے اور زمین کی ساخت عمدہ ہونے کے باوجود یہاں سے کاشت کاری کا حصول مشکل ہدف تھا۔ مزید مغرب میں چناب اور ستلج کا درمیانی علاقہ وادیٔ سندھ کے ساتھ ساتھ میانوالی، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازیخان کے اضلاع تھے۔ یہ پنجاب کا پسماندہ ترین علاقہ تھا جہاں زراعت بہت کم اور غیر ترقی یافتہ اور ذرائع آمدورفت قدیم طرز کے تھے جن کا زیادہ تر انحصار دریائے سندھ کے بہاؤ پر ہوتا۔ ایک طویل عرصہ تک یہ اضلاع پنجاب کے باقی علاقوں سے کٹے ہوئے تھے اور سندھ کے ساتھ ان کے تعلقات و روابط دوستانہ بنیادوں پر استوار تھے اور انہی تعلقات کی بنا پر ان کے تعلقات و روابط دوستانہ بنیادوں پر استوار تھے اور انہی معاملات کی بنا پر یہاں کی زبان اور طبعی خصوصیات پر سندھی ماحول کا اثر صاف دِکھتا ہے۔ اس علاقے کی زیادہ تر قابل کاشت زمین بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت تھی۔ شمال میں شاہ پور، جہلم، راول پنڈی اور اٹک کے اضلاع ہیں جہاں پنجاب کے میدانی علاقے کا اختتام ہو جاتا ہے اور پہاڑی علاقہ اور کوہِ نمک کی ناہموار اور پتھریلی سرزمین کا آغاز ہوتا ہے۔ باوجود اس کے کہ یہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے لیکن آبپاشی کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث کاشت کاری کے سلسلہ یہاں موجود نہیں۔ زمین کی سطح سخت ہونے کے باعث ان علاقوں میں کاشت کاری یوں بھی جوئے شیر لانا کے مصداق ہے۔ لہٰذا یہاں کے نوجوان فوجی بن کر زراعت سے حاصل ہونے والی محدود آمدنی میں اضافے کی سعی کرتے ہیں۔

پنجاب کا معاشرہ زیادہ تر دیہی ہے۔ یہاں کے مکینوں کی آبادی کی ایک بڑی تعداد دیہات میں رہتی ہے۔ جہاں زیادہ تر لوگ مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں مقیم ہوتے ہیں۔ ان گھروں کے چاروں طرف حفاظتی مقصد کیلئے دیوار بنا دی جاتی ہے۔ دیہات میں تمام گھر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس خطے کے دیہات میں سیاسی اثر ورسوخ کا سرچشمہ زمین کی ملکیت ہوتی ہے۔

> ’’نظامی مشینری قائم کرتے وقت مغلوں اور سکھوں کی طرح انگریزوں نے بھی اس اہم حقیقت کوملحوظ خاطر رکھا کہ زمیندار طبقے کے تعاون کے بغیر انتظامی امور کی انجام دہی بہت مشکل امر ہوگا البتہ اپنے پیش رو اصحابِ اقتدار کے برعکس انگریزوں نے اقتصادی اصلاحات بھی متعارف کروائیں جس کے نتیجہ میں شہری متوسط طبقے نے جنم لیا، جن کے مفادات روائیتی مقتدر طبقات سے متضاد تھے۔ یہیں سے دو (ایک دوسرے کی مخالف) سیاسی روایات کا وجود عمل میں آیا جنہیں شہری و دیہی سیاسی روایات کا نام دیا گیا۔[۲۹]

گوٹالبوٹ کا بیان خالص سیاسی پنجاب کے حوالے سے ہے اور اس میں صوبہ میں تشکیل پاتی اور مروج ہوتی سیاسی صورتحال کا نقشہ کھینچا گیا ہے لیکن اس کی روشنی میں ہم پنجاب کے دو طبقات، شہری طبقہ اور دیہی اشرافیہ کے درمیان موجود اختلاف کو سمجھ سکتے ہیں جس پر پورے پنجاب کا مزاج متعین ہو رہا ہے اور آگے چل کر یہی مخصوص مزاج رسم ورواج، عقائد ونظریات اور ادبی نکتہ نظر کے متعین وترویج کے باعث رہا ہوگا۔ اس سارے منظر نامے میں پنجاب کا وہی کردار اس کی بدامنی سے عبارت ہنگامہ خیز تاریخی

جدل کے نتیجے میں تشکیل پایا ہے۔ اسی بدامنی کی وجہ سے اس صوبہ میں اقتصادی و زرعی ترقی کا عمل بے حد سست رہا ہے۔ جس کی وجہ سے زمینداروں میں اپنی زمینوں پر رہتے رہنے کی عادت ایک پریت کی شکل اختیار کرتی چلی گئی او ایک اعلیٰ طرزِ زندگی کا نمونہ یہاں ترویج نہ پا سکا۔ اس کے برعکس رسمی و روایتی زندگی جو عہد قدیم کی نمائندہ تھی اپنی پُرانی اور کہنہ شکل میں قائم رہی چونکہ پنجاب کو وادی گنگا کے دروازے کی حیثیت حاصل رہی (گو تقسیم کے بعد اس کی حالت مختلف ہے اور عمومی وکلی حالات بھی) ہے۔ اس لئے سکندرِ اعظم کے زمانے سے یہ خطہ حملہ آوروں کی مسلسل یلغاروں کیلئے انتخاب پاتا رہا۔ یہ حملہ آور لوٹ مار کرتے ہوئے جرنیلی سڑک (جو دہلی کو کابل سے ملاتی ہے) تک جا پہنچتے اور وادئ گنگا وجمنا میں داخل ہو جاتے۔ پنجاب کے بعض قصبات جرنیلی سڑک کے کنارے ہی تجارتی مراکز کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے۔ مثال کے طور پر اٹک، جہلم اور گجرات کی ترقی اسی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی کیونکہ وہ دریاؤں کے کنارے اسی مقام پر آباد تھے جہاں سے ان دریاؤں کو عبور کیا جاتا تھا اور یہی وہ بڑی وجہ تھی جو ان قصبات کی جغرافیائی اہمیت کا باعث بنی۔ لاہور اور ملتان اس صوبے کے ایسے شہر تھے جن کی اپنی اپنی ثقافتی میراث تھی لیکن ہندوستانی مرکز دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے لاہور خاص اہمیت کا حامل رہا جبکہ ملتان کو وہ خصوصیت نہ دی گئی جو لاہور کے حصہ میں آئی، جس کی ایک بڑی وجہ دونوں شہروں کا جغرافیہ ہے لیکن بہرحال ان دونوں شہروں کو شمالی ہند میں واقع دہلی، لکھنؤ اور آگرہ جیسے ثقافتی وسیاسی مراکز کے ساتھ تقابل وموازنہ کیلئے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس سارے منظر نامے میں اگر پنجاب کی دیہاتی زندگی کو ترتیب دیا جائے تو دیکھنے میں آتا ہے کہ پنجاب کی دیہی آبادی مختلف حصوں میں تقسیم ہے۔ ان کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ زمیندار جو کہ زرعی زمین کے بڑے بڑے قطعات کے مالک ہیں اور اپنی زمین کاشت کی غرض سے مزارعین کے حوالے کرتے ہیں۔ چھوٹے کاشت کار جن کی ملکیت تھوڑی بہت زرعی زمینیں ہوتی ہے اور اس کو زیر کاشت لا کر وہ اپنی زندگی کے دھارے کو قائم رکھتے ہیں۔ مزارعین، جو کہ اکثر اوقات کافی دولت مند ہوتے، بڑے بڑے زمینداروں کی زمینوں پر کاشت کاری کے علاوہ ان کی اپنی بھی زرعی زمین ہوتی ہے، اس کے علاوہ ملازم طبقہ جو کہ مختلف کام کاج کرتا ہے۔ یہ طبقہ زمینداروں کی خدمت کرتا اور اس کے عوض فصلوں میں سے معمولی حصہ وصول کر کے اپنی گزر اوقات کرتا ہے، آخر میں بے زمین کھیت مزدور ہیں جن کی زندگی اور پیٹ میں جلتی آگ کی تشنگی کا پورے کا پورا دارومدار زمینداروں پر ہوتا ہے۔

جہاں تک زمین کی ملکیت کے تناسب کا معاملہ ہے تو یہ مشرقی اور مغربی پنجاب میں بے حد مختلف ہے۔ مشرقی اضلاع میں مزارعین کا طبقہ آٹے میں نمک کے برابر ہے، یہاں کے دیہی ڈھانچے میں زمینداری کے قومیتی عنصر کو پورا تحفظ حاصل تھا۔[۳۰]

لیکن مغربی پنجاب میں اور خاص کر اٹک جیسے ضلع میں کل زرعی اراضی کے نصف سے زیادہ وہ مزارعین کاشت کیا کرتے تھے جنہیں مالک یا زمین دار اپنی مرضی سے بے دخل کر سکتا تھا۔ یہ مزارعین یا تو زمینداروں کو فصلوں کی کٹائی کے بعد نقد رقم ادا کرتے تھے یا پھر بٹائی کے طور پر جنس میں ہی ادائیگی کرتے تھے۔[۳۱]

مقامی طور پر اس پیٹرن سے بعض اوقات استثنیٰ بھی دکھائی دیتا تھا۔ مثلاً مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور کے نواب ممدوٹ کی جاگیر 60,000 ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی جبکہ مغربی پنجاب کے اضلاع جہلم، گجرات اور راولپنڈی کی بیشتر زمین چھوٹے کاشت کاروں

کی ملکیت تھی۔ یہ بات حیران کن ہے کہ پنجاب کے جاگیرداروں کے قبضہ میں بڑی بڑی اراضیاں تھیں لیکن اس کے باوجود ان کی ملکیتی زمین اُس قدر نہ تھی جتنی کہ اودھ کے تعلقہ داروں کے قبضہ وملکیت کا حصہ تھی۔ مغربی پنجاب کے سب سے بڑے زمیندار لغاری اور کوٹ گھیبہ کے تھے۔ ان خاندانوں کی جائیدادیں ڈیرہ غازیخان اور اٹک کے اضلاع میں واقع تھیں۔ لغاریوں کی جاگیر 100,000 ایکڑ جبکہ گھیبوں کی جاگیر 60,000 ایکڑ اراضی پر مشتمل تھی۔[۳۲]

لیکن یہ وسیع وعریض جاگیریں اودھ میں محمود آباد تعلقہ دار خاندان نو کی زیرملکیت 397 مربع میل پر پھیلی جاگیر کے مقابلے میں معمولی وقعت کی حامل تھی۔ لغاریوں اور گھیبوں کی جاگیریں 88 مربع میل پر پھیل ہوئی تھیں، لہذا اسے محمود آباد کے تعلقہ داروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ شاہ پور کے ٹوانے اور ملتان کے دولتانے پنجاب کے سب سے بااثر زمیندار گھرانے تھے۔ البتہ ان کی کالرہ اور لڈن کی جاگیریں جو بالترتیب 15,000 ایکڑ اور 20,000 ایکڑ اراضی پر مشتمل تھیں۔ اودھ کے معیار سے محض درمیانے درجے کی جاگیریں تھیں۔[۳۳]

یہ بات ہندوستانی جاگیردارانہ نظامِ زندگی کے ایک پہلو کی عکاس ہے کہ کس طرح کچھ خاندان اور افراد پورے کے پورے معاشرے اور نظامِ زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں اور پورے سسٹم کے مزاج کے تعین میں اُن کا دخل ایک سامراجی قوت کی علامت اختیار کر لیتا ہے اور حق ملکیت اُن کے اختیارات کو اس حد تک وسیع کر دیا ہے کہ اُن کی پسند وناپسند اور عمل دخل پورے معاشرتی نظام کو مستشکل کر رہا ہوتا ہے۔ اس خوفناک حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض:

''اودھ کے ضلع بیرائچ میں 23 تعلقہ دار 1652 گاؤں پر حق ملکیت رکھتے تھے۔ جن کی مجموعی اراضی تقریباً ساڑھے 12 لاکھ ایکڑ بنتی ہے''۔[۳۴]

اس ایک بیان سے اندازہ لگائیں کہ 1652 دیہات اور ان دیہاتوں کے مکین ایک خاندان کے رحم وکرم اور قہر وغضب پر اپنی زندگی گزارتے تھے اور اپنے نوابین کی سوچ، فکر اور دائرہ عمل کو عبور کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔

''اودھ کے جاگیرداروں کے بارے میں ایک معمولی غلط فہمی رواج پا گئی تھی کہ یہ جاگیریں نیم خود مختار آزاد ریاستیں تھیں، جہاں مزارعین، مقبوضہ زمیندار کے ہر حوالے سے فرمانبدار ہوتے تھے۔ حقیقت کو مدنظر رکھا جائے تو یہ نقطہ نظر نہایت کمزور اور اصل حقائق سے یکسر برعکس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جاگیردار اپنی بکھری ہوئی جاگیروں پر معمولی نوعیت کا کنٹرول رکھتے تھے جبکہ حقیقی کنٹرول منشی کے پاس ہوتا تھا۔ نظامِ جاگیر کو چلانے کی خاطر وہ ہی مختلف دیہات کے سربراہوں سے رابطہ میں رہتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جاگیروں کا نظام اس قدر سادہ نہ تھا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی یہ طاقت کے ارتکاز ایک نقطۂ تک محدود تھا''۔[۳۵]

مغربی پنجاب کے زمیندار اپنے اپنے علاقوں پر اس وجہ سے اثر ورسوخ قائم رکھے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنی زمینوں سے رابطہ منقطع نہ کیا تھا۔ اپنی جائیداد پر گرفت رکھنے کی دو بڑی وجوہات نظر آتی ہیں ایک تو اس علاقہ کے غیر معینہ سماجی حالات کے باعث زمیندار طبقہ سمجھتا تھا کہ انہیں اپنے علاقے اور وہاں بسنے والے ہر خاص وعام پر گہری نظر رکھنی چاہئے اور دوسری وجہ ان کا یہ

ادراک تھا کہ ان کا سماجی رتبہ اور قدر ان کے زرعی رقبوں کی وجہ سے ہے یعنی زرعی زمین کا مالک ہونا عزت، وقار اور مرتبے کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان زمینداروں کی طاقت ورسوخ کی ایک اور بڑی وجہ ان کا اپنی اپنی برادریوں کا سربراہ ہونا بھی ہے۔ جس کے باعث ان دیہاتوں میں ایک خاص طرح کی سادہ اور بردبار مزاج کی حامل ذہنیت پروان چڑھتی اور پنپتی ہوئی نظر آتی ہے، جس کے ضمیر میں ہند ایرانی تصوف اور روحانیت کے نمایاں عناصر کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یوں زمینداروں کے اس رویے نے ایک مجہول اور غیر فعال کردار کو تعمیر کیا جس کی ذاتی پسند نہ پسند اور مرضی کا کوئی وجود نہیں اور اسی کی ذاتی زندگی، معاشی وسائل حتیٰ کہ ذاتی گھریلو معاملات بھی جاگیردار کے دائرۂ عمل میں ہوتے ہیں اور وہ جیسا عمل چاہے اس کے ساتھ کرسکتا ہے۔ یوں گویا اس طبقہ کے ہاں انا اور خوداری کے وہ معنی نہیں جو لغات اور اخلاقیات کی کتابوں میں درج ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اولاد کے متعلق فیصلہ سازی کا حق بھی نہیں رکھتے اور اسی سلسلے میں بھی انہیں اپنے جاگیردار، تعلق دائرہ زمیندار وغیرہ کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوتی ہے۔

انگریزوں نے آغاز سے ہی اس صوبے میں برادریوں اور زمینداروں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور ان کے عوامل کو سامنے رکھ کر لائحہ عمل تیار کئے۔ انہوں نے ہی مناسب جانا کہ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کیلئے پنجاب کی ایسی ہی سماجی تنظیموں کا تعاون حاصل کیا جائے چنانچہ فرقہ وارانہ وفاداریوں کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے قبائل اور برادریوں کی طاقت اور اثر پر انحصار کرنا بہتر سمجھا اور اسی لائحہ عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے دو بڑے سماجی گروہ، جو بعد میں مربوط اداروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں انگریز راج کی کھلی ہمدردی اور نوازشات کا بے تحاشا دخل ہوتا ہے، ایک زمیندار اور دوسرا صاحب خانقاہ، جسے ہم پیر، سجادہ نشین کی صورت میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

پیر، سجادہ نشین اس حد تک مضبوط کردار ہے کہ اس کا مرید اُس کی مرضی ومنشاء کے بنا ووٹ ڈالنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ عام رویہ یہ ہے کہ مرید ووٹ کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتا ہے اور اُس کو اس سارے عمل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی لیکن اگر پیر اشارہ کرے تو وہ والہانہ اس عمل میں شریک ہو جاتا ہے اور اگر پیر کا اپنا اُمیدوار میدان سیاست کا سوار ہوا تو یہ بات ناممکن ہے کہ مرید اپنے پیر کو چھوڑ کر کسی اور شخص یا پارٹی کو ووٹ دے۔ ایسے مریدین کی نہ کوئی پارٹی ہوتی ہے نہ کوئی سیاسی ایجنڈا، بلکہ ان کی مرضی صرف اور پیر کی رضا وخوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔

عہد موجود میں خانقاہ نے مسلم معاشرے میں (پاکستانی مسلم معاشرہ) ایک باقاعدہ اور منظم ادارے کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اب تو صورتحال یہ ہے کہ خانقاہوں سے حاصل ہونے والی سالانہ آمدن کروڑوں روپے تک ہوتی ہے اور ان درباؤں پر حاضری کیلئے آنے والے لوگوں کی تعداد سیکڑوں سے لیکر ہزاروں تک ہوتی ہے۔ دن رات یہاں لوگ حاضری کیلئے آتے ہیں، اس لحاظ سے دربار یا خانقاہ کو آج جدید تر شہری منصوبہ بندی اور فن تعمیر کے اُصول وضوابط کے مطابق پرکھنے، ڈیزائن کرنے، توسیع کرنے اور زائرین کو سہولیات فراہم کرنے پر توجہ دی جاتی ہے۔

> ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق خانقاہ فارسی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد ایک ایسی عمارت کی قسم ہے جو کسی خاص صوفی سلسلے سے متعلق صوفیا اور ان کے مریدین کے زیر استعمال رہتی ہے''۔[۳۶]

صوفیا اور بزرگ جب تک حیات رہے ان کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا، وصال کے بعد ان کے حجرے کو ہی ان کی جائے تدفین بنا دیا گیا اور اُن کے مریدین کیلئے یہ جائے تدفین، مزار یعنی زیارت گاہ کا درجہ اختیار کر گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اُسی جائے تدفین پر صوفی یا بزرگ کے وصال کے بعد اُس کے خلیفہ نے اُس کی تعلیمات کو جاری رکھا۔ اِن مقامات پر عموماً دو طرح کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک مریدین یا زائرین یا مسافر جو زیارت یا حاضری کی تما لئے یہاں آتے تھے اور مختصر قیام کے بعد چلے جاتے تھے جبکہ دوسرے وہ لوگ ہیں جو یہاں مستقل رہتے تھے، یہ خدمت گار، منتظم، متولی، گدی نشین یا بزرگ کے خاندان سے متعلق لوگ ہوتے تھے جو زیارت کیلئے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہتے، ان کی میزبانی کرتے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔

عہد قدیم میں خانقاہ یا دربار پر آنے والوں کیلئے کچھ اخلاقی پیمانے مقرر کر لئے گئے تھے جن کی پابندی کرنا ہر زائر کیلئے لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ جو کوئی ان اُصولوں کی خلاف ورزی کرتا، اُس کو دربار اور اہلیان دربار کی نگاہ میں عزت اور توقیر حاصل نہ ہوتی تھی مثلاً اگر کوئی صوفی کسی دربار پر آنا چاہتا، تو اُس کیلئے لازم تھا کہ وہ سہ پہر سے پہلے پہنچ جائے، دو رکعت نماز نفل ادا کرے اور پہلے سے موجود افراد و اصحاب کے ساتھ ملنے میں گرمجوشی کا اظہار کرے۔ عمومی روایت یہ تھی کہ آنے والے کو کچھ نہ کچھ کھانے کیلئے پیش کیا جاتا، عام طور پر یہ قیام تین روزہ ہوتا، جس میں شیخ سے ملاقات کی جاتی اور رخصت ہونے سے پہلے باقاعدہ اجازت طلب کی جاتی تھی۔ اگر کسی کا قیام تین روز سے زائد ہوتا تو اُس کیلئے خدمت بجا لانا ضروری تھا۔ خانقاہ یا دربار میں پہلے سے موجود لوگوں کیلئے ضروری تھا کہ وہ نئے آنے والے لوگوں سے خوش دِلی سے ملیں، اُن کا احترام کریں، چہرے پر مسکراہٹ کے ساتھ اُن سے ملیں تاکہ کسی قسم کی بددلی، ناپسندیدگی یا نظرانداز کرنے کا تاثر نہ اُبھرے اور نہایت شفقت سے پیش آئیں، خدمت گاروں کا دورانِ گفتگو نرم اور شفیق رہنا لازم تھا۔ اگر نئے آنے والے زائر کو آدابِ خانقاہ سے واقفیت نہ ہوتو اُس کی تضحیک اہل خانقاہ کو منع تھی اور ضروری تھا کہ اُن کا رویہ اُس کے ساتھ توہین آمیز نہ ہو۔

یہ سارا منظر نامہ برصغیر پاک و ہند میں تشکیل پانے والے معاشرتی اور سماجی نظام میں نہایت اہمیت کا حامل ہے جس نے غیر محسوس طریقے سے اس خطۂ ارض کے لوگوں کو متاثر کیا اور خاص کر پنجاب کے عوام ان اثرات سے خود کو نہ بچا سکے اور اِن درباری اور خانقاہی رسم ورواج، آداب، عقیدتوں، یقینوں اور کہیں اِن کے پس پردہ تقدیری فلسفہ کے زور پکڑتے جذبات نے پنجاب کے کلی سیاسی، سماجی اور تہذیبی دائرے کو متاثر کیا۔ اس ساری بحث کو غافر شہزاد کی اس رائے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

> ''چشتیہ سلسلے کی خانقاہوں میں جماعت خانے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جماعت خانہ اجتماعی زندگی کیلئے ایک مرکز تھا جہاں بادشاہ سے فقیر تک قیام پذیر ہوتے۔ یہیں پر اخلاقی اور روحانی کلچر تشکیل پاتا۔ یہ سماجی اور ثقافتی زندگی کے مراکز تھے۔ چشتی صوفیاء کے ہاں مہمان نوازی ایک اہم ترین جزو رہا ہے۔ جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا، چشتی صوفیاء کا خیال تھا کہ اگر کوئی شخص کہیں رہ جائے اور اُسے کھانا پیش کیا جائے تو وہ ایسے ہے جیسے وہ مردہ شخص کے ہاں گیا۔ اگر کچھ بھی خانقاہ میں پیش کرنے کیلئے نہ ہوتو کم از کم پینے کیلئے پانی ضرور پیش کیا جاتا۔ لنگر کے اخراجات فتوح یا نذرانہ جات سے پورے کئے جاتے۔ یہ جماعت خانے سب کیلئے کھلے ہوتے، امیر غریب، بادشاہ فقیر، سب کو خوش

آ مدید کہا جاتا۔ خواجہ معین الدین چشتی کے خیال میں صوفیاء کو دریا کی طرح سخی، سورج کی طرح شفیق اور زمین کی طرح مہمان نواز ہونا چاہئے۔ شیخ کی زندگی میں خانقاہ میں شب وروز کی سرگرمیاں اور مقاصد مختلف تھے۔ شیخ کے بعد یہی خانقاہ محض مزار بن کر رہ گئی، جہاں عقیدت مند اور زائرین محض زیارت کیلئے اور اپنی خواہشات اور تمناؤں کے بَر لانے کیلئے دُعا مانگنے آتے، چادریں، دیگیں اور نذرانہ جات پیش کرتے ہیں۔ اب ان مزارات پر اہل صحبت اور اہل خلوت نہیں ملتے ہیں بلکہ زائرین کو صرف اہل خدمت ملتے ہیں جو ان کی خدمت کم کرتے اور اپنی خدمت زیادہ کرواتے ہیں''۔ ۳۷

اس ساری بحث سے ہمارے سامنے چند اہم بنیادی باتیں آئی ہیں جن کو آنے والے وقتوں میں برصغیر کے عوام کیلئے راہ نجات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی اور معصوم اور انجان لوگوں کے حقوق کی پامالی، استحصال کیلئے اِن نکات کو بطور آلہ استعمال کیا جاتا رہا۔ ان میں سے تین خصوصیات ایک فرد کے کردار کے متعلق ہیں جبکہ تین حالتیں مزار پر موجود لوگوں کے حوالے سے ہیں۔ افراد کی خصوصیات کچھ یوں ہیں کہ اُن کو دریا کی طرح سخی ہونا چاہئے۔ گویا سخاوت کو کرداری سطح پر ایک نہایت اہم خوبی کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ اُس کو سورج کی طرح شفیق ہونا چاہئے جو اندھیروں میں اُجالوں کا سامان کرے، تیرگی کو روشنی میں بدل دے، کلیوں کو کھلنے کا چارہ فراہم کرے، گویا ایک مسیحا اور رہبر کی تمام خوبیاں ایک فرد میں ہونا ضروری ہیں جو خود تو جلے لیکن دوسروں کی مُرادیں بَر لائے اور تیسری بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُس کو زمین کی طرح مہمان نواز ہونا چاہئے جو کہ مادر ہے، گویا ''ماں'' کا استعاراتی کردار بھی ایک فرد کو نبھانا ہوگا۔

اس سارے منظر نامے میں پنجاب میں دوقسم کے کردار ہمارے سامنے آتے ہیں، پہلا سیاسی نظام اور سیاسی افراد کا جو انگریزی عہد میں پلے بڑھے اور پنپے، اُن جاگیرداروں کا جنہوں نے اپنی جاگیر، جائیداد، مفادات اور روزگار کے تحفظ کیلئے سیاست کو بطور کاروبار اور ڈھال کے اپنایا، ان کا کوئی مذہب نہیں سوائے اپنے فائدہ کے، ان کی کوئی اخلاقیات نہیں، ماسوائے اس کے کہ وہ تمام افعال جو اُن کیلئے فائدہ مند اور سودمند ہوں۔

جبکہ دوسرا کردار عوام سے متعلق ہے جس کا مرکز اُس کی ذات کے بجائے، اُس کا سماج ہے۔ وہ ایک سورج ہے، ایک دریا ہے، ایک ماں ہے، اُس کی اپنی کوئی خواہش نہیں، اُس کی اپنی کوئی ضرورت نہیں۔ اُس کا دامن خوشیوں سے بھرا ہوا ہے اور جو چاہے اس دامن سے اپنی خوشیاں وصول کرتا چلا جائے، اُس کا کام اپنے سینے میں دبائے بیج سے تناور درخت کی آبیاری کرنا ہے، خشک صحراؤں اور تپتے ریگستانوں کو گلزار بنانا ہے، تیرہ بستیوں اور اندھیری وادیوں کو روشن کرنا ہے اور اس سب کے بدلے میں اُس کو صبر، قناعت اور شکر کی دولت سے نوازا جاتا ہے۔

اس سارے منظر نامے میں پنجاب اور پورے برصغیر میں ایک نیا کلچر تعمیر ہو رہا تھا جس کو نہ تو ایرانی یا عربی کلچر کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ ہندی کلچر تھا۔ یہ ایک نئی شکل تھی جو مختلف تہذیبوں اور سماجوں کے ادغام سے تشکیل پا رہی تھی اور اسی نئی شکل نے آگے چل کر معاشرے کی کلیت میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا تھا۔

اس بات کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ اسلامی کلچر عقیدوں کا گہرا رنگ لئے ہوئے ہے، ظاہر سی بات ہے کہ اسلام بنیادی طور پر ایک عقیدہ ہے اور کلچر اس کا عملی اظہار، مسلم معاشرے میں اسلام ایک حالت فاعلی ہے، اس لئے اس تناظر میں پیدا ہونے والا کلچر اسلامی کلچر یا مسلم کلچر کہلائے گا۔ اب اس بات کو ذرا گہرائی سے دیکھیں کہ مذکورہ بالا عقائد میں دو طرح کے تضادات پائے جاتے ہیں یعنی وہ کلچر جو اشرافیہ نے اختیار کر رکھا تھا اور وہ کلچر جو عوام کیلئے رائج تھا۔ اشرافیہ خود خانقاہ، دربار اور مزار کے گدی نشین، متولی وغیرہ تھے اور اس کو بطور ایک ادارے کے استعمال کرتے، وہ اِن سے ایک ہی وقت میں دو کام لیتے تھے، اول دولت کا حصول جو اُن کے اثر ورسوخ اور دربارِ شاہی میں مداخلت کا ذریعہ تھا اور دوم عوام میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ اُن کے عقل وذہن کی ایسی نشوونما جو خود اُن کے حق میں بہترین ہو۔ مزار یا خانقاہ کے اندر موجود لوگ بھی تین طرح کے ہوتے تھے جیسا کہ ہم غافر شہزاد کی رائے سے جان سکے ہیں۔ ایک اہل خلوت، اہل صحبت اور اہل خدمت۔

''انگریزی عہد میں ان خانقاہوں کا نظام 1810ء اور 1863ء کے انگریزی حکومت کے ایکٹ کے تحت چلایا جاتا رہا، جہاں پہلے ریونیو بورڈ انتظام و دیکھ بھال کرتا تھا اور پھر ضلعی مجسٹریٹ اور مقامی افراد پر مشتمل کمیٹی ان مزارات کی دیکھ بھال اور رسومات کی ادائیگی کا اہتمام کرتی رہی۔ 1960ء سے سرکاری سطح پر چاروں صوبوں میں محکمۂ اوقات ان مزارات کی دیکھ بھال، تعمیر ومرمت اور توسیع کا کام سرانجام دے رہا ہے، یہاں سے حاصل ہونے والے نذرانہ جات اوقات سنٹرل فنڈ میں جمع ہوتے ہیں۔ عرس کی تمام رسومات حکومتی نگرانی میں سرانجام پاتی ہیں۔ آج یہ مزارات اور ان کا انتظام کہیں زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہو گیا ہے۔ زائرین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کو سہولیات بہم پہنچانے کیلئے حکومتی مشینری نے کہیں زیادہ فعال نظام کر رکھا ہے۔ سال بھر میں ہونے والی تمام سرگرمیوں میں سب سے اہم عرس کا انعقاد ہے جو پہلے ایک روزہ ہوتا تھا مگر اب بڑے مزارات پر دو یا تین روزہ ہو گیا ہے۔۔۔ پہلے پہل خانقاہ صرف شیخ کے مزار پر مشتمل ہوتی تھی جہاں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تعمیر کی جاتی تاکہ زائرین نماز ادا کر سکیں۔ خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر مختلف مغل بادشاہوں نے اس طرح کی تین مساجد تعمیر کرائی ہیں جبکہ حضرت علی ہجویری، بابا بلھے شاہ اور حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے مزارات پر موجود قدیمی چھوٹی مساجد کو گرا کر بہت بڑی جامع مساجد تعمیر کی گئی ہیں جو شہر میں اب مرکزی جامع مسجد کی حیثیت رکھتی ہیں، اسی طرح زائرین کیلئے حفاظت پاپوش، مسافر خانے کی تعمیر، طہارت و وضو کی سہولت، سماع ہال، لنگر خانے، پارکنگ، داخلی دروازے، دکانات، پولیس چوکی، لینڈ اسکیپ وغیرہ کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے''۔[۳۸]

عہد موجود میں دربار نے ایک مکمل ادارے کی شکل اختیار کر لی ہے جو براہ راست یا بالواسطہ عہد موجود میں دربار نے ایک مکمل ادارے کی شکل اختیار کر لی ہے جو براہ راست یا بالواسطہ معاشرتی اقدار، رسم ورواج، تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہو رہا ہے اور پنجاب کے شہروں کی کھچا کھچ ٹریفک زدہ زندگی سے لیکر دریاؤں کے طفیل سیراب زدہ لہلہاتے کھیتوں کے کنارے آباد لوگوں تک ان رسم ورواج کے اثرات مستقل ہوتے رہتے ہیں۔ جس نے اس خطبہ میں تقدیر پسندی، صبر وتشکر، قدامت پرستی وغیرہ ایسے رویوں کو نہ صرف جگہ دی بلکہ اُنہیں گہرائی تک قبول کیا۔ اگر حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، بابا بلھے شاہ، حضرت علی ہجویری، حضرت سخی سلطان

باہو، حضرت خواجہ غلام فرید اور بری امام سرکار کے مزارات پر نظر دوڑائی جائے تو مزار شریف کہ جس کو اس نے سارے نظام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے کے علاوہ کئی دیگر لازمی عناصر دربار کمپلیکس کا حصہ بن چکے ہیں، ان تمام عناصر کے درمیان باہمی ربط بھی موجود ہے مگر انفرادی حیثیت میں ان میں ہونے والی سرگرمیوں اور رسومات نے ایک مخصوص شکل اختیار کر لی ہے جس کے اثرات دربار اور مزار کے درودیوار سے نکل کر دور دور تک پھیل رہے ہیں اور اس خطہ میں پھیلنے پھولنے والی زندگی براہ راست ان سے اثرات لیتی ہے۔

مولانا حسام الدین ملتانی کو جب خواجہ نظام الدین اولیاء نے خلافت عطا کی تو انہوں نے پیش کئے جانے والے نذرانہ جات کے متعلق استفسار کیا، مولانا حسام الدین ملتانی نے فرمایا:

> ''جب میرے پاس فتوحات (بغیر مانگے نذرانہ جات) آتی ہیں تو اس میں سے کچھ اپنے فرزندوں پر خرچ کرتا ہوں اور کچھ مسافروں کیلئے رکھتا ہوں اور کبھی ایسا وقت بھی آیا ہے کہ جب کئی کئی دن تک کچھ نہیں آتا تو اس وقت میرے بال بچے مجھے تنگ کرتے ہیں اور مسافر بھی محروم رہ جاتے ہیں کیا میں ایسے موقع پر قرض لے سکتا ہوں''۔[۳۹]

اس سوال کے جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا وہ اپنی جگہ ایک مکمل اور جامع موضوع ہے۔فرماتے ہیں:

> ''اگر تم قرض لو گے تو وہ دو حال سے خالی نہ ہوگا یا تو تم اپنے بال بچوں کیلئے لو گے یا مسافروں کیلئے، یہ مسافر بھی دو قسم کے ہیں یا تو وہ مسافر ہیں جو دور دراز سے آتے ہیں یا اسی شہر کے لوگ ہوں گے جو تمہارے پاس روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کیلئے جو دور دراز سے آتے ہیں اگر کچھ قرض حاصل کر لو تو کوئی حرج نہیں، اس کیلئے تم معذور سمجھے جاؤ گے۔ جو لوگ شہر سے آتے ہیں ان کیلئے تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہے سو ہے، رہا بال بچوں کا معاملہ سو اگر تمہارے پاس فتوحات آئیں تو اس میں سے خرچ کرو، اگر کچھ نہ ہو قرض لے سکتے ہو لیکن اگر اسی لین دین کے چکر میں رہو گے تو درویشی کے فرائض کب سرانجام دو گے، درویش تو وہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے پاس موجود ہو تو خرچ کرے ورنہ صبر کر لے اور نامرادی کے ساتھ بسر کرے''۔[۴۰]

مندرجہ بالا حکایت سے نظام خانقاہی کو چلانے کیلئے مالی ذرائع پر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی ایک درویش اور سچے مسلمان کے اوصافِ حمیدہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے اور یہ معلوم پڑتا ہے کہ خانقاہ کے سجادہ نشیں، گدی نشیں، متولی وغیرہ کا کردار کس نوعیت کا ہونا چاہئے۔

آج اکیسویں صدی میں یہ ادارہ ایک دوسری شکل میں سامنے اُبھرتا ہے جہاں سے تعلیمات واثرات کا وہ سلسلہ تقریباً بند ہو چکا ہے جس کے اثرات عہد رفتہ میں پورے معاشرے پر ہوتے تھے ورنہ خطۂ پنجاب میں بسنے والا کسان، مزدور، تاجر، اُستاد، چوکیدار، مدرس، سیاستدان، بادشاہ، فقیر، امیر، غریب غرض ہر شعبۂ زندگی اور طبقۂ حیات کے افراد اس ادارے کے اثرات کو قبول کرتے اور اپنے روزمرہ کے معمولات میں ان کو برتتے تھے۔ لہٰذا اس معاشرے کے افراد کے عمومی اور خصوصی رویوں کو سمجھنے کیلئے اس ادارے کی فعالیت اور اثر اندازی کو نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ اگر تھوڑا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اس خطۂ زمین میں پائی جانے

والی مذہب پسندی، تقدیری جبر پر یقین، اَن دیکھے خداؤں پر اعتقاد، ماورائی قوتوں پر اعتقاد وغیرہ ایسے رجحانات کے ڈانڈے بھی اسی نظام سے تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ گو صوفیاء کا یہ مقصد نہ تھا اور نہ ہی اُن کی زندگیوں میں اس نوعیت کا تبلیغی مواد یا تعلیمی نظام ملتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دوسرے انتظامی فعال شعبوں نے سماج پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کیلئے، اس ادارے کو استعمال کیا اور اس کے پس پردہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔

صوفیاء میں بھی مال ودولت کے ارتکاز کے حوالے سے اختلاف رہا، چشتی صوفیا اور سہروردی صوفیا دو الگ الگ نظریات اور حکمت عملی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے غافر شہزاد کی رائے کو بطور حوالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

''چشتی سلسلے کے صوفیاء جس قدر حکمرانوں اور مال ودولت دُنیا سے بھاگتے سہروردی اتنا ہی خوش دلی سے فتوح قبول کرتے تھے، فتوح میں چشتی صوفیاء زمین کا تحفہ قبول نہ کرتے تھے مگر سہروردیوں نے سیکڑوں ایکڑ اراضی فتوح میں حاکم وقت سے قبول کی۔ وہ عوام الناس سے گھلنے ملنے کو بھی زیادہ پسندیدہ نہ سمجھتے تھے بلکہ ان سے ملنے کیلئے مریدوں کو شاہی دربار کی طرح باقاعدہ اجازت نامہ لینا پڑتا تھا۔ پنجاب میں سہروردی سلسلے کے بانی حضرت بہاء الحق زکریا ملتانی نے جب انتقال فرمایا تو اپنے پیچھے ہر بیٹے کیلئے سات لاکھ تنکے (چاندی کا سکہ) ترکے میں چھوڑے جبکہ ہزاروں ایکڑ اراضی درگاہ کے نام وقف تھی جسے آٹھویں دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو نے اشتمال اراضی کے دوران ہاریوں کو اس زمین کے مالکانہ حقوق دیئے''۔[۴۱]

پروفیسر محمد حبیب کی رائے اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔

''دورِ مغلیہ اور اس کے بعد صوفیاء کے مراکز کا طرۂ امتیاز فقر کے بجائے اوقاف ہوگئے ہیں اور ان اوقات کی ضامن حکومت وقت تھی''۔[۴۲]

صوفیاء کرام نے اپنی زندگی میں تو سلاطین وقت سے نذر ونیاز یا مدد معاش کچھ ایسے خوشگوار انداز میں قبول نہ کی بلکہ اس سے دور بھاگتے رہے مگر ان صوفیاء کے وصال کے بعد جب بادشاہ مزارات پر حاضر کیلئے آتے تو لین دین کے نئے نئے طریقے وضع ہونے لگے، جن کی تفصیلات میں جانا اس مقالے کا مطمع نظر نہیں۔ نور احمد چشتی دربار حضرت بی بی پاک داماں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہاں پر پہلے چار مجاور تھے جن میں سے ایک لاوارث فوت ہو گیا، آج کل تین مجاور ہیں۔ عظیم شاہ، اللہ دین اور محمد بخش۔ چوتھا وارث جو لاوارث فوت ہوا اس کا حصہ عظیم شاہ اور اللہ دین نصفا نصفی لیتے ہیں۔ سال بھر میں کل اڑتالیس جمعرات آتی ہیں۔ ان میں سے ساڑھے اُنیس جمعرات کی آمدن عظیم شاہ اور ساڑھے انیس جمعرات کی آمدن اللہ دین لیتا ہے، بقیہ نو جمعراتوں کی آمدن محمد بخش کو ملتی ہے، اسی طرح ہر مہینے میں سے بارہ دن عظیم شاہ، بارہ دن اللہ دین اور چھ دن محمد بخش چڑھت آمدن لیتا ہے۔ اس طرح قبرستان میں جو میت دفن ہونے کے واسطے آتی ہے اس سے ملنے والی آمدن بھی تقسیم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک روپیہ ملے تو پانچ آنہ حق گورکنی ہے جبکہ گیارہ آنہ

سجادگان میں درج بالا نسبت سے بانٹ لیا جاتا ہے تاہم عرس کے روز خرچ و چڑھت مشترک رہتی ہے''۔[۴۳]

کمال حیرت کی بات ہے کہ جو مقام صوفی کو اپنی زندگی میں حاصل ہوتا ہے، وصال کے بعد وہی مقام اُس کی درگاہ یا مزار کو حاصل ہو جاتا ہے بلکہ عقیدت و ارادت کے جذبات جو عقیدت مندوں اور زائرین کے ہاں پائے جاتے ہیں، بعد از وصال اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس درگاہ اور اس سے متعلق دیگر عمارات کی تعمیر و توسیع کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ درگاہیں اور خانقاہیں بڑے اداروں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں اور شہری آبادی میں ان کی موجودگی گردو پیش کی عمارات پر اور سیاسی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، مذہبی، سرگرمیاں ان پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔

خصوصاً شہری آبادی میں درگاہ کی حیثیت ایک مقناطیس ایسی ہوتی ہے جو اپنی جیسی فطرت وشکل رکھنے والے زائرین وعقیدت مندوں کیلئے بے پناہ کشش اور کھچاؤ رکھتا ہے اور جس طرح ہر مقناطیس کے گرد ایک حلقۂ کشش (Magnetic Field) ہوتا ہے کہ لوہ چون جب اس کی کشش کی حدود میں آتے ہیں تو اول باہم کشش کا احساس جنم لیتا ہے اور جب قدرے قریب ہوں تو کھچے چلے آتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی صورتِ حال سے زائرین اُس وقت دوچار ہوتے ہیں جب وہ کسی صوفی یا شیخ کے حلقۂ ارادت میں آتے ہیں، شیخ ایک مقناطیس کی طرح ان کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور پھر جیسے لوہ چون جو مقناطیس کے ساتھ چپکے رہتے ہیں، ان کے اپنے اندر کشش کی قوت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال سے زائرین گزرتے ہیں اور اپنی اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق ان کے اندر روحانی تبدیلیاں وقوع پذیر ہونے لگتی ہیں۔ زائرین کی خواہشات، تمنائیں، آرزوئیں، منتیں اگر پوری ہو رہی ہوں تو درگاہ پر حاضر ہونے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس معاملے میں یہ ایام بھی ضروری نہیں کہ زائر مسلم بھی ہو بلکہ ان صوفیاء کی کرامات کا سلسلہ مذہب کی بجائے انسان دوستی کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ زائرین کی توجہ، کشش کا مرکز ومحور دراصل شیخ کی شخصیت ہوتی ہے اور یہ کرشمہ صوفی کی شخصیت کی وہ روحانی قوتیں دکھاتی ہیں جو وصال کے بعد بھی لوگوں کو اپنے حلقۂ اثر اور حلقۂ عقیدت میں مضبوطی سے جکڑے رکھتی ہیں۔ عموماً یہ تصور کیا جاتا ہے کہ ایک وقت میں تمام کائنات کو تین سو اسی (380) صوفیاء کنٹرول کرتے ہیں۔ ان میں قطب، ولی، ابدال، اوتاد وغیرہ شامل ہیں۔ زائرین کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ جس طرح زندگی میں صوفی اور شیخ نے لوگوں کی مدد کی ہے اور اُن کیلئے صلہ اور سہولت کیلئے کوشش کرتا رہا ہے۔ وصال کے بعد بھی وہ اسی طرح بلکہ زیادہ مؤثر انداز سے ان کی داد رسی کر سکتا ہے۔ جب زائرین کی خواہشات اور تمنائیں پوری ہو جاتی ہیں اور دُعائیں قبول ہو جاتی ہیں تو شیخ پر ان کا عقیدہ اور اعتماد اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے اور اگر شنوائی نہ ہو تو زائرین کسی دوسری درگاہ کا رُخ کرتے ہیں۔ جب تمنائیں بر آئیں، شیخ پر اعتماد مضبوط تر ہو جائے تو زائرین کی حاضری کی تعداد میں اضافہ ہونا قدرتی امر ہے اور وہ نہ صرف خود حاضری دیتے ہیں بلکہ عزیزوں، رشتہ داروں اور اقرباء کو بھی ہمراہ لاتے ہیں اور اجتماعی تشکر ادا کرتے ہیں۔ صوفیاء کی عارفانہ شاعری لوگوں کے دِلوں پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے اور انہیں جذباتی طور پر زیادہ متحرک کرتی ہے اور وہ زیادہ عقیدت اور طمانیت اور کشش سے صاحب مزار کی جانب رُخ کرتے ہیں۔ مختلف علاقوں سے تمنائیں لئے، متنوع ثقافت وتہذیب کے باشندے درگاہ پر آ کر ایک دوسرے کے ساتھ ایک اَن دیکھے رشتے میں جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں کہ ان کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ زائرین خون کا

رشتہ نہ ہونے کے باوجود''پیر بھائی'' کے رشتے میں منسلک ہو کر معاشرے میں ایک علیحدہ گروہ کی حیثیت سے اُبھرتے ہیں اور ان کے عادات و اطوار اور خصائل سے پورے کا پورا معاشرہ متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔اس خانقاہی نظام نے ایک خاص طرح کے معتقد اور غیر فعال کردار کوتعمیر کر کے معاشرے کا حصہ بنایا،جس کو خدا کے وجود کے اثبات کے لیے ایک مرشد، ہادی اور رہنما کی ضرورت رہتی ہے، اور اس کا اپنا فکری نظام مفلوج حالت میں رہتا ہے۔ یہ کردار خدا، انسانی، سماج اور ان سب کے مابین تعلق کی نوعیت پر غور وفکر کرنے کی بجائے اپنے مرشد کے آستانے پر ماتھا ٹیکے رہتا ہے اور اپنی خواہش کو مرشد کی خواہش پر قربان کرنا اپنی کامیابی اور فلاح گر مانتا ہے۔ اس سارے تانے بانے میں اس کی حیثیت ایک نامکمل انسانی کی سی ہے جو اپنی راہ کے تعین کے لیے دوسروں کی آنکھیں استعمال میں لاتا ہے۔ اور اس کی اپنی سوچ مقلدانہ اور غیر منطقی ہوتی ہے۔ اس نظام نے جدید حالت میں ڈھل کر ایک ادارے کی شکل اختیار کرلی ہے اور یورپی سرمایہ دارانہ نظام کا ایک بہترین نمائندہ ہے جس کے تحت پرورش پانے والے کردار تقدیر کے قائل اور منشائے خدا اور منشائے مرشد کو حرف آخر سمجھتے ہیں اور ان کی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

اس خطۂ زمین کا تمدنی ماضی بے حد تابناک اور حیران کن خصائص پر مشتمل ہے۔ یہ تمدن اپنی قدامت کے اعتبار سے دُنیا کی قدیم ترین تمدنی قوت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور خاص بات اس کی یہ ہے کہ یہ کئی حوالوں سے اپنے ہم عصر تمدنوں سے ممتاز اور منفرد ہے۔ اس تمدن کی شاندار روایات و اقدار کی طرح ڈالنے اور انہیں ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھانے میں اس خطے کے دریائی نظام کا بڑا دخل ہے۔ یہ دریائی نظام دُنیا کا پانچواں بڑا دریائی نظام ہے جو یہاں کے لوگوں کیلئے ایک بیش بہا قدرتی عطیہ ہے۔ دریائی پانی کی سال بھر فراہمی، قدرتی بارش اور زیر زمین پانی کی وافر مقدار میں موجودگی سے سرزمین پنجاب کی زرخیزی اور پیداواری صلاحیت روزِ اول ہی سے انفرادی رہی ہے۔ ان حالات میں بکثرت زرعی پیداواری، دولت کی ریل پیل اور اور خوش حالی کے باعث یہ خطۂ انتہائی قدیم عہد میں دُنیا بھر میں''سونے کی چڑیا'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا جو انسان یہاں پیدا ہوا وہ سازگار ماحول دیکھ کر ہمیشہ یہیں کا ہو رہا، اس کی خوشحالی کے باعث جو غیر ملکی حملہ آور، تاجر، مبلغ، فن کار، طبیب اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کے لوگ یہاں آئے اُن کا مَن اس جگہ ایسا لگا کہ پھر وہ اپنے اصلی وطن واپس جانا بھول گئے۔ غیر ملکیوں میں دراوڑی، منڈا زبانیں بولنے والے، آریہ، یونانی، چینی، ایرانی، تورانی، منگول، غزنوی، جیلانی، مغل وعرب اور یورپی افراد سرفہرست ہیں جو یہاں آ کر ایسے آباد ہوئے کہ پھر کبھی واپسی کا نام تک نہ لیا۔ یہاں کی زبان ایسی سیکھی کہ اپنی زبانِ مادر تک بھول گے۔غرض چند سالوں میں ان پر مقامی ماحول اور ثقافت کا ایسا رنگ چڑھا کہ وہ بالکل مقامی معلوم ہونے لگے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ان نوواردوں کے ساتھ ان کی روایات، رسوم ورواج، عقائد و توہمات، عادات و اطوار، اخلاق وآداب، نظریات وتصورات، علوم وفنون، زبان وادب، مذہب و قانون بھی آئے جن کا اکثر حصہ وہ بھول بھال گئے لیکن ان جملہ شعبہ جات کے کئی عناصر مقامی تہذیب وتمدن میں مدغم ہو گئے۔ چنانچہ ان غیر ملکیوں اور مقامی تمدنوں کے باہمی اختلاط سے پنجاب کا تمدنی وتہذیبی چہرہ ہمیشہ عالمِ شباب ایسی تازگی اور شگفتگی سے تمتا تا رہا۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کا انسان اپنے مزاج کی سطح پر وسعت اور آفاقیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ محنتی، ذہین، چاک چوبند اور مستعد ہوتا ہے اور دُنیا کے کسی بھی خطے اور آب وہوا اور موسم میں گزر اوقات کر لیتا ہے۔ مہمان نوازی، رواداری، حوصلہ

مندی، جرأت، آگے بڑھنے کی صلاحیت اور بہادری اس کے مزاج کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

تمدنِ پنجاب کا ایک ایک پہلو تابناک اور لائقِ تحسین ہے۔ پنجاب کے تمدن کی ارتقائی کہانی بھی لائقِ ستائش ہے لیکن اس پر کسی قسم کی بحث اور تفصیلات ہمارے مقالے کا حصہ نہیں، لہٰذا اس اور اس نوع کی دوسری تفصیلات و جزئیات سے دانستہً دامن بچایا گیا گا تاکہ ہر قسم کی موضوعی گنجلک سے محفوظ رہا جا سکے۔

تعلیم، لسان، ادیان، ادب، مذہب، فنِ موسیقی، فنِ تعمیرات، فنِ تحریر وغیرہ کے اثرات اس خطے پر نہ قابلِ فراموش ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمدن کی تشکیل وترقی میں انسانوں کے علاوہ وہاں کی زمین کا بھرپور کردار ہوتا ہے اور اسی نوعیت کا بھرپور اور صحت مند کردار اس خطۂ کی زمین نے اس علاقے کے تمدن کی ترقی وافزائش میں ادا کیا۔ اس خطۂ زمین میں تاریخی دور کے آغاز کے بارے میں محققین میں اختلافِ پایا جاتا ہے، ان میں سے بعض اس کا آغاز رگ وید کی تخلیق کے ساتھ کرتے ہیں جبکہ بعض کی نظر میں اس دور کا آغاز پنجاب میں 800 ق م یا 600 ق م میں ہوا تھا۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ یہاں تاریخی دور کا آغاز آریوں کی آمد (1600 ق م) میں رگ وید کی تخلیق کے ساتھ شروع ہوگیا تھا کیونکہ یہ ایک مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ آریوں کے بعد ایران کے منخا منشی پنجاب میں برسرِ اقتدار آئے، ان کا اقتدار اس علاقے میں سکندرِ اعظم کے حملوں کے دوران اختتام پذیر ہوا۔ بعدازاں چندرگپ موریہ برسراقتدار آیا تو اس طرح یہاں کے تاریخی دور میں پہلی مرتبہ ایک مقامی حکومت قائم ہوئی جو ایک قلیل المدت حکومت ثابت ہوئی۔ اس کے بعد باختری یونانی، ہندی یونانی، ساکا یاشک، پارتھی یا پہلوا، کشان، ساسانی، کیدارکشان، ہن، کشمیری راجے اور دوسرے مقامی راجے مہاراجے اور آخر میں ہندو شاہی خاندان برسرِاقتدار آئے۔ جن میں سے اکثر غیر ملکی تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کا تعلق یونان، وسطی ایشیاء، چین اور ایران سے تھا۔ لہٰذا تاریخ کے اس قدیم دور میں یہاں کے تمدنی ماحول پر زبردست غیر ملکی اثرات مرتب ہوئے جس کے نتیجے میں یہاں کا تمدن رنگا رنگ تہذیبوں کا ایک گہوارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ یوں یہاں بہت سے مزاج تعمیر ہوئے ایک طرف مذہبی شدت پسندی ہے تو دوسری جانب دنیا کی بے ثباتی کے ادرات کے باعث مال وحشمت سے محبت اور لالچ ہے لیکن ایک بڑی تعداد ایسے کردار کی ہے جو غیر جانب دارره جاتا ہے اور اس کی حیثیت معروضی ہے۔ اس کا احساس جذبات اور ذاتی پسند ناپسند ایک اضافی شئے ہے وہ محض ایک ناظر اور بے معنی وجود کی طرح اشیاء ومظاہر کا مشاہدہ کرتا چلا جاتا ہے جس کے باعث اس کی ذاتی اناء کہیں دب جاتی ہے یا پھر وجود سے عاری ہو جاتی ہے یہ کھوکھلے کردار اگر وجود کا اظہار مانگتے بھی ہیں تو وہ اناء اور کسی حد تک حقیقی عزت نفس سے عاری رہتا ہے جدید اردو نظم جو راشد، میرا جی، مجید امجد اور فیض کے بعد ادھورے پن کا شکار ہوگئی ہے اور اسی میں برتے جانے والے جذبات و احساسات میں بیشتر کی حالت کارپس مواد(Carpus Material) کی سی ہے، کا مطالعہ آئندہ ابواب میں اسی مفروضے کے تحت کیا جائے گا کہ مسلمانوں اور انگریزوں کے علمی اور فکری تسلط میں نمو پانے والے اس معاشرے اور انگریزی سے درآمد کردہ اس صنف کے موجودہ تخلیق کار اپنی تخلیقی جہت میں کس حد تک اناء، عزت نفس کے برتاؤ اور اظہار میں دیگر قوتوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ضمیر حسن، سید، مشمولہ، دلی کی تہذیب، مرتبہ انتظار مرزا ڈاکٹر، اردو اکادمی، دہلی، 1987، ص 13، 14

۲۔ ضمیر حسن، سید، دلی کا آخری دیدار (مرتبہ) اردو اکادمی، دہلی، 1986، ص 13، 14

۳۔ نثار احمد فاروقی، مشمولہ، دہلی کی تہذیب، مرتبہ انتظار مرزا، ڈاکٹر، اردو اکادمی، دہلی، 1987ء، ص 41

۴۔ دو بوئر، ٹ، ج، تاریخ فلسفہ اسلام، مترجم عابد حسین ڈاکٹر، فکشن ہاؤس، لاہور، 1994ء، ص 8

۵۔ ریاض صدیقی، اردو زبان وادب کے مسائل، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1989ء، ص 41

6. Quoted in the Rig-vedic Gelogy and the dand of the Sapta-Sindhu, Dr Jawala Parsad Pingeal Punjab Past and Present No.1, Part II, Oct 1967, P.205

7. Quoted in, the Rig-vedic Gelogy and the Land of the Sapta Sindhu, op, city, 207

8. Punjab`s Narvying Frontieres in the Past and the Nomenclature, op, cit, PP, 63, 64

۹۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، پنجاب تحقیق کی روشنی میں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1991ء، 229

۱۰۔ ایضاً، 229

۱۱۔ محمد لطیف، سید، تاریخ پنجاب، تخلیقات لاہور، 1994ء، 59

۱۲۔ ایضاً، 59

13. Encyclopedia Britannica (macropedia), vol. 15, USA, 1974, 285

۱۴۔ مفتی غلام سرور، لاہوری، تاریخ مخزنِ پنجاب، لکھنؤ، نولکشور، 1877ء، ص 49

۱۵۔ محمد باقر، ڈاکٹر، پنجاب کا سیاسی معاشرتی، فکری اور تہذیبی پس منظر تاریخ ادبیات مسلمانِ پاکستان وہند، ج 13، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، 1971ء، ص 158

۱۶۔ اُردو دائرہ معافِ اسلامیہ، ج 5، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، 1971ء، ص 648

۱۷۔ عین الحق فرید کوٹی، پنجابی کی ابتدائی نشوونما، تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان وہند، ج 13، ص 212

۱۸۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، پنجاب تحقیق کی روشنی میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1991ء، 231

۱۹۔ ایضاً، ص 232، تا 233

۲۰۔ بخشیش سنگھ نجر، پنجاب انڈر دی سلطانز، لاہو، 1979ء، ص 186

۲۱۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر، پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ، الفیصل، لاہور، 1998ء، ص 181 تا 182

۲۲۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، لاہور، 1972ء، ص 57

۲۳۔ محمد شجاع الدین، ''لاہور سیاسی اور ثقافتی تاریخ'' مشمولہ نقوش، نقوش، لاہور نمبر، لاہور، 1962ء، ص 38

۲۴۔ ریاض صدیقی، اُردو زبان وادب کے مسائل، نفیس اکیڈمی، کراچی، 1989ء، ص 89

۲۵۔ علی الدین، مفتی، عبرت نامہ، ج 1، لاہور، 1961ء، ص 8

۲٦۔ عشرت رحمانی، ڈاکٹر، پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ، الفیصل لاہور، 1998ء، ص 17

۲۷۔ ایضاً، ص 212

۲۸۔ تاریخ پنجاب، آئن ٹالبوٹ، مترجم طاہر کامران، پروفیسر، تخلیقات، لاہور، 2006ء، ص 12

۲۹۔ ایضاً، ص 26

30. H. Joseph, Final Report of the 3rd Revenue settelment of the Rohtak District, 1905-10, Lahore 1911, P 17

31. Ch. Sardar Khan, Final Report of the 4th Revneue Settlement Report of the Attock District 1923-7, Lahore, 1928, P.17

32. Imperial Gazzette of India, Vol Xv, Oxford, 1908, P.409

۳۳۔ تاریخ پنجاب، آئن ٹالبوٹ، طاہر کامران، پروفیسر، تخلیقات، لاہور، 2006ء، ص 29

34. Gazzette of the Province of Oudh, Vol 1, Lucknow, 1877, P.199

35. P.J.Musghavc, Landlords and Lords of the Land; Estate Management and Social Control in utar Pardacsh, 1860-1920, Modern Asian Studies, 6, 3, 1972, P.274

۳٦۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، جلد چہارم، 1978ء

۳۷۔ غافر شہزاد، پنجاب میں خانقاہی کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص 81

۳۸۔ غافر شہزاد، پنجاب میں خانقاہی کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 2009ء، ص 82

۳۹۔ امیر خسرو، سیر اولیاء، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، 1996ء، ص 414

۴۰۔ امیر خورد، سیر الاولیاء، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، 1996ء، ص 414

۴۱۔ غافر شہزاد، پنجاب میں خانقاہی کلچر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، 2009ء، ص 91

۴۲۔ خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، مکتبہ عارفین، کراچی، 1953ء، ص 19

۴۳۔ نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، الفیصل، لاہور، 2001ء، ص 162